آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتینِ دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2025

قیمت: 15/- ₹

www.urducouncil.nic.in

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

- کہکشاں ◆ زبان شناسی
- میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
- بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

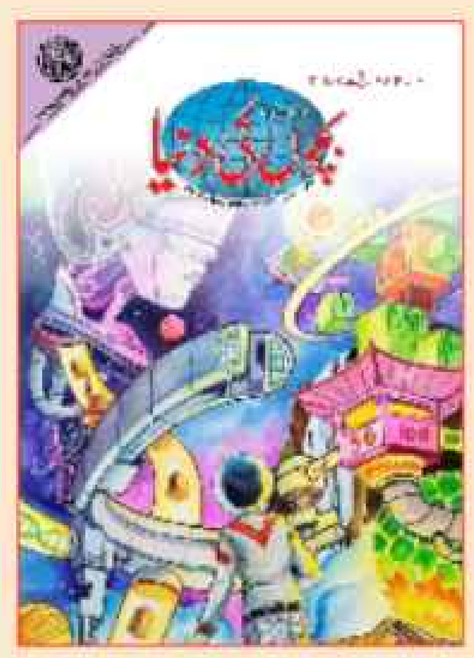

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:15روپے   سالانہ:145روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اردھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 9 شمارہ: 8 اگست 2025

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65

نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اوراس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-49539000

شعبۂ ادارت: 011-49539009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002

فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل — مدیر — 4

تحریک آزادی اور خواتین

تحریک آزادی کی فراموش کردہ عظیم خواتین — بلقیس مقبول — 5

شخصیات

علم کا سمندر: مجنوں گورکھپوری — درخشاں تاجور — 9

سرسید کے رفیق کار علامہ شبلی نعمانی — شاذیہ عمیر — 13

شہریار کی غزل میں آرزو کا عمل — نصرت پروین — 17

ترنم ریاض کی شاعری کے مختلف پہلو — نگہت — 21

ساجد رشید کے افسانوں میں سماجی وسیاسی شعور — رہنما بانو — 25

محمد شفیع مونس کا جہانِ غزل — صدف نفیس — 30

جہان نسواں

سیاسی، سماجی، تعلیمی انقلاب اور خواتین — شجاع الدین شاہد — 33

گوجر بکروال خواتین کو درپیش مسائل — شاذیہ ممتاز — 37

ادب اور ماحولیات

ادب اور ماحولیات کے مابین رشتہ — جمیلہ خاتون — 40

حسن سخن

غزل — نازیہ افروز — 45

غزل — رقیہ خاتون — 45

غزل — فوزیہ اختر ازکیٰ — 46

افسانے

پرندوں بھری جھیل — سلمیٰ صنم — 47

ایک نئی شروعات — آمنہ سحر — 50

حقیقی پردہ — قاضیہ تضمین — 54

ارتباط

قارئین کے خطوط — 59

مشعل

15 اگست تاریخ ہند کا ایک روشن اور نا قابل فراموش دن ہے۔ اسی دن ہندوستان نے صدیوں پر محیط غلامی کی بیڑیوں سے خود کو آزاد کیا اور ایک آزاد قوم کے طور پر اقوام عالم میں اپنی شناخت قائم کی ۔ یوم آزادی صرف سیاسی آزادی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ مسلسل جدو جہد، شعور اور اجتماعیت کا بھی علامیہ ہے۔ ہندوستان کی آزادی میں جہاں مردوں نے بے شمار قربانیاں دی ہیں، وہیں ہندوستانی خواتین نے بھی تحریک آزادی میں اپنا گراں قدر کردار ادا کیا ہے۔ خواتین نے جانفشانی، قربانی اور عزم و استقلال کی جو اعلیٰ مثال پیش کی ہے وہ جلی قلم سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اگر ہم تحریک آزادی کی پوری تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین نے سماجی جبر، مذہبی پابندیوں اور روایتی رکاوٹوں کو پس پشت ڈال کر آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ وہ خاموش تماشائی نہیں تھیں بلکہ مردوں کے شانہ بہ شانہ قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھیں۔ وہ جلوسوں میں شامل ہوئیں، انقلابی تحریریں لکھیں، خفیہ پیغامات پہنچائے، رسن و دار تک پہنچیں اور اس طرح اپنی جانوں کے بھی نذرانے پیش کیے۔ ظاہر ہے کہ خواتین کی ان قربانیوں کو کسی طور سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے تذکرے کے بغیر جہد آزادی اور تحریک آزادی کا ذکر بے معنی ہے۔ اس سیاق میں جب بھی ہندوستانی خواتین کا نام لکھا جائے گا رانی لکشمی بائی کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ انھوں نے شجاعت و بہادری کی اور عزم و استقلال کی ایسی نظیر پیش کی ہے جس سے تاریخ کے صفحات بھی خالی نظر آتے ہیں۔ 1857 کی جنگ آزادی کے حوالے سے ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ ہاتھ میں تلوار لے کر انگریزوں کے خلاف لڑنے والی یہ جانباز خاتون مجاہد آزادی ہندوستانی مزاحمت کی علامت بن گئی۔ آزادی کے حوالے سے سرلا دیوی، اینی بیسنٹ، سروجنی نائڈو، کستور با گاندھی، ارونا آصف علی، بی اماں،، بیگم حضرت محل، عزیزن بائی، کامنی رائے وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خواتین نے تحریک آزادی میں نہ صرف اہم رول ادا کیا ہے بلکہ آزادی کے لیے اپنی جانوں کی پرواہ کیے بغیر کار ہائے نمایاں انجام دیے۔ ان میں سے بعض خواتین کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ بعض خواتین کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ بعض کی معاشی زندگی غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی۔ مگر ان کے عزم و حوصلے پر حرف نہیں آیا۔ ان کے ارادے متزلزل نہیں ہوئے۔ ان لوگوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کیا کہ آزادی صرف مردوں کی جنگ نہیں ہے بلکہ ہر اس ہندوستانی کی جدو جہد کا ایسا مرحلہ ہے جو ظلم و نا انصافی اور غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار کر پھینک دینا چاہتا ہے۔

یوم آزادی صرف ماضی کے دنوں کو یاد کرنے کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ دن ہمیں اس جانب بھی متوجہ کرتا ہے کہ ہم ان تمام مجاہدین آزادی اور گمنام خواتین آزادی کو بھی یاد کریں جن کی قربانیوں نے آزادی کے اس سفر میں اپنا تعاون پیش کیا ہے اور جس کے سبب آزادی ممکن ہو سکی ہے۔ ہم نے آزادی کا جو خواب دیکھا تھا وہ نہ صرف شرمندہ تعبیر ہوا بلکہ ہندوستان کی ہر عورت کو خود مختار اور با اختیار بنانے کے لیے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں۔ آج ہندوستانی خواتین زندگی کے مختلف شعبوں میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ مردوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں۔ ان کے حوصلے بلند ہیں اور ان کی آرزوئیں ستاروں پر کمندیں ڈال رہی ہیں۔ حکومت ہند نے بھی وکست بھارت کے تحت ناری شکتی کا نعرہ دیا ہے تا کہ خواتین کو پہلے سے کہیں زیادہ خود مختار اور با اختیار بنایا جا سکے۔ اگر زندگی کے کسی میدان میں کسی علاقے میں کہیں کوئی عورت پیچھے رہ گئی ہے تو اسے بھی ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔ تو آئیے یوم آزادی کے اس خوشگوار موقعے پر ہم یہ عزم کریں کہ ہم ناری شکتی کے نعرے کو عملی صورت عطا کرنے میں اپنا تعاون پیش کریں گے۔

آپ کا

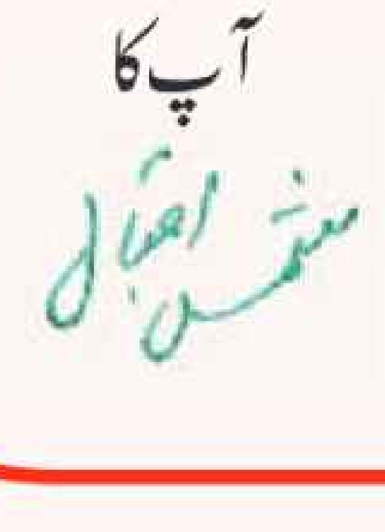

بلقیس مقبول

تحریک آزادی کی فراموش کردہ عظیم خواتین

ہندوستان کی آزادی میں خواتین کی شمولیت کا آغاز 1817 کے اوائل میں ہوا جب بھیما بائی ہولکر نے انگریزوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنی ریاست اور قوم کے تحفظ کے لیے بندوق اٹھائی۔ ان کے بعد 1857 کی پہلی باضابطہ جنگِ آزادی میں بھی عورتوں کی شرکت مثالی رہی۔ یہاں صرف شاہی خانوادوں کی بیگمات ہی نہیں، بلکہ ایسی خواتین بھی میدان میں آئیں جنھوں نے شاید ہی کبھی گھر کی دہلیز پار کی ہو۔

جب انگریزی سامراج نے ظلم وستم کا بازار گرم کیا تو جھانسی، اودھ، منڈلا، تلسی پور کی رانیاں، طوائفیں، اور عام عورتیں سب یک جان ہوکر میدانِ عمل میں کود پڑیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بہادر شاہ ظفر کا جھنڈا تھامنے والا کوئی مرد نہ بچا، تو ایک طوائف نے جنگی لباس پہن کر جھنڈا بلند کیا۔ ایسی جرأت، ایسی سرفروشی، شاید ہی دنیا کے کسی اور انقلاب میں نظر آئے۔

ہم جب جنگِ آزادی میں خواتین کا ذکر کرتے ہیں تو رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، کملا نہرو، ارونا آصف علی جیسے معروف نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔ ان کی قربانیاں تاریخ میں محفوظ ہیں اور ان کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہی تاریخ ان ہزاروں گمنام خواتین کی قربانیوں پر خاموش نظر آتی ہے، جن کے کارنامے کتبِ تاریخ کی گرد میں دب گئے ہیں۔ وہ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں، جنھوں نے خاموشی سے جنگ کو سہارا دیا، جنھوں نے خطوط پہنچائے، دوائیں مہیا کیں، خفیہ پیغام رسانی کی اور کئی بار مردوں سے زیادہ حوصلہ دکھایا، آج ہمارے شعور کا حصہ نہیں ہیں۔

(Velu Nachiyar)

ویلو نچیار: ویلو نچیار سوانگنا تامل ناڈو کی شہزادی تھیں۔ وہ پہلی ملکہ تھیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی اور 1780 میں برطانوی حکومت کو شکست دے کر اپنی سلطنت واپس حاصل کر لی تھی۔ شیر دل خاتون اپنی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے ہندوستان کی پہلی رانی کی جھانسی کہلاتی ہیں۔

عزیزن (Azeezan)

: جنگ آزادی کی تاریخ میں کانپور کی طوائف عزیزن کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ مادر وطن کی خاطر اس مجاہدہ کی قربانی بے لوث ہے۔ 4 جون 1857، کانپور انقلابیوں کا پڑاؤ تھا، سر

جارج ٹریولین کے مطابق 7 جون 1857 کونا نا صاحب پیشوا کی طرف سے ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندو مسلمانوں سے مشترکہ اپیل کی گئی کہ وہ اپنے ملک کی خاطر برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کے لیے متحد ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی ہوں۔ فوجی بھرتی کا اعلان سنتے ہی عزیزن گھر بار چھوڑ کر ساتھیوں سمیت میدان جنگ میں کود پڑی۔ اس نے عورتوں کی ایک چھوٹی سی فوج منظم کی، وہ گھر گھر جاتی، عورتوں کو گھڑسواری اور ہتھیار چلانا سکھاتی۔ خواتین کی یہ چھوٹی سی فوج زخمی سپاہیوں کو طبی امداد پہنچاتی، سپاہیوں کے لیے گولا بارود فراہم کرتی۔ اس کے علاوہ جاسوسی کرنا، جنگی اطلاعات حاصل کرنا اور ان کو مختلف اہم شخصیتوں تک پہنچانا ان کا خاص مقصد تھا۔

وہ جنگ آزادی کی پہلی مجاہدہ تھی جس نے اس رعایت کو حقارت سے ٹھکرا دیا، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ان کا یہ قدم بقیہ انقلابی ساتھیوں کے حوصلے پست کر دے گا۔ ہیولاک نے پھر پوچھا آخر تمھارا مقصد کیا ہے؟ عزیزن کا جواب تھا؟ ہر ممکن طریقے سے برطانوی حکومت کا خاتمہ۔ ہیولاک نے مجبوراً سپاہیوں کو فائر کرنے کا حکم دیا اور گولیاں نازک بدن کو چھلنی کر گئیں۔

اونتی بائی (Avanti Bai): اونتی بائی 1857 کے انقلاب کی ایک نقیب رائے گڑھ مدھیہ پردیش کے آدی واسی ضلع منڈلا کی حکمراں تھیں 1851 میں رائے پور پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اونتی بائی اس نا انصافی کو برداشت نہیں کر سکیں۔ جیسے ہی 1857 کے انقلاب کی گھن گرج شروع ہوئی، انھوں نے آس پاس کے راجاؤں، ٹھاکروں اور جاگیرداروں کے ساتھ شنکر شاہ کی قیادت میں عین دسہرے کے دن انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ شنکر شاہ اور اس کے بیٹے انگریزوں کے عتاب کا شکار ہوئے جنھیں پکڑ کر توپ سے اڑا دیا گیا لیکن اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انگریز انفنٹری میں بغاوت ہوگئی، انگریز کمانڈر مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ اونتی بائی کافی دن تک گڑھ منڈلا پر حکومت کرتی رہیں۔ دوسرے محاذوں کی طرح یہاں بھی انگریزوں کی سازش کامیاب ہوئی اور آزادی کی متوالی اونتی بائی کو خودکشی کے لیے مجبور ہونا پڑا لیکن رانی کی جنگی صلاحیت اور بہادری تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔

اصغری بیگم (Asghari Begum): اصغری بیگم بھی ہماری تاریخ کی ایک گمنام ہیروئن ہیں، جنھوں نے نہ صرف اپنے بیٹے قاضی عبدالرحیم کو آزادی کے لیے تیار کیا بلکہ خود بھی جدوجہد کا حصہ بنیں۔ 1811 میں تھانہ بھون، ضلع مظفر نگر (اتر پردیش) میں پیدا ہونے والی اصغری بیگم کو 1857 کی جنگ میں برطانوی حکومت کے خلاف مزاحمت کے الزام میں گرفتار کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ ان کی بے مثال قربانی اس بات کی غماز ہے کہ آزادی کی لڑائی کسی خاص طبقے، علاقے یا حیثیت تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر اُس دل میں سلگ رہی تھی جو غلامی کے خلاف تھا۔

ماتنگینی ہزرہ (Matangini Hazra): Quit India Movement اور Non Cooperation Movement ماتنگینی ہزرہ کی رکن تھی۔ غریب گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر پائیں۔ کم عمری میں شادی ہوئی اور 18 سال کی عمر میں بیوہ ہوگئیں۔

ماتنگینی ہزرہ Civil Disobedience Movement تحریک آزادی میں سرگرم عمل تھیں۔ 1932 میں حصہ لیا اور مہاتما گاندھی کی قیادت میں ڈانڈی مارچ میں حصہ لینے اور سالٹ توڑنے کے الزام میں انھیں گرفتار کیا گیا۔ ماتنگینی نے اکہتر سال کی عمر میں تاملوک پولیس اسٹیشن پر قبضہ جمانے کے لیے 6000 حامیوں کے

ساتھ ایک جلسے کی قیادت کی۔ اسی دوران ان پر تین گولیاں چلائی گئیں لیکن ان کے اندر آزادی کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ جان نکلتے وقت بھی وہ ہندوستانی جھنڈے کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں اور وندے ماترم کا نعرہ تب تک لگاتی رہیں، جب تک وہ خون میں لت پت وطن کی مٹی کو گلے لگا کر ہمیشہ کے لیے الوداع نہ کہہ گئیں۔

کنک لتا بارو (kanaklata Baru): کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ انھوں نے ہندوستان چھوڑ

تحریک میں اہم حصہ لیا اور جلسوں میں کنک لتا بارو 'بیر بلا' خواتین رضا کاروں کے ساتھ بڑی دلیری سے ہاتھ میں ہندوستانی جھنڈا لیے انگریزوں کے خلاف نعرہ بازی کی۔ ان کا مقصد برطانوی پولیس اسٹیشن پر قومی جھنڈا لہرانا تھا لیکن 18 سال کی عمر میں انگریزوں نے گولی مار کر بیر بلا کی نعرے بازی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا۔

بی اماں (Abadi Bano Begum): 1917 کی تحریک

خلافت کی وجہ سے آزادی کی لڑائی میں جو شدت آئی اس میں بھی چند خواتین کا بہت اہم حصہ رہا۔ ان خواتین میں مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی کی والدہ بی اماں نے اہم رول ادا کیا۔ بی اماں ان پڑھ ہونے کے باوجود سلیقہ مند اور بہادر خاتون تھیں۔ جب وہ تحریک آزادی میں شامل ہوئیں تو ان کا شمار اچھے مقرروں میں کیا جانے لگا۔ عملی طور پر ان کی سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگ عظیم سے ہوا۔ بعد میں وہ خلافت تحریک کی فعال رکن بنیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں جا کر نوجوان مردوں اور عورتوں میں آزادی کا جذبہ ابھارتی رہیں۔ خواتین کانفرنس کی صدارت کی اور اپنے زمانہ کی دوسری سرگرم خواتین کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ ساتھ ہی ان کے عزم و ارادے سے مردوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ 1924 میں آزادی کے لیے کام کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

بھیکا جی کاما (Bhikaji Cama): تحریک آزادی کی ایک

اور جیالی خاتون بھیکا جی کاما ہیں۔ اگر چہ ملک بھر میں اس نام کی کئی سڑکیں اور عمارتیں موجود ہیں لیکن صرف چند ہی لوگ ان کی شخصیت سے واقف ہوں گے۔ 1907 میں انھوں نے پہلی بار (World Socialist Conference, Germany) ورلڈ سوشلسٹ کانفرنس، جرمنی میں ہندوستان کا قومی پرچم لہرایا اور نامور انقلابی مولانا برکت اللہ بھوپالی، شیام جی کرشن ورما اور لالہ ہر دیال کی طرح ہندوستان کے باہر تحریک آزادی کے لیے دنیا کے انصاف پسند عوام کی حمایت حاصل کی۔ بھیکا جی نہ صرف ہندوستان کی کے تحریک آزادی کا حصہ تھیں بلکہ صنفی مساوات (Gender Equality) لیے بھی انھوں نے اہم کام کیا۔

کملا دیوی (Kamla Devi): کملا دیوی ہندوستانی

لجسلیٹو نشست کا انتخاب لڑنے والی پہلی خاتون تھیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ برطانوی حکومت سے گرفتار ہونے والی بھی پہلی خاتون تھیں۔ انھوں نے ایک معاشرتی مصلح کی حیثیت سے بہت اہم کردار ادا کیا اور ہندوستانی خواتین کے معاشرتی اور معاشی معیار کو بلند کرنے کے لیے دستکاری تھیٹر اور ہینڈلوم دوبارہ شروع کرایا۔

امجدی بیگم (Amjadi Begum): امجدی بیگم مجاہد آزادی محمد علی جوہر کی رفیقہ حیات تھیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ان کی سیاسی زندگی میں شریک رہیں۔ انھوں نے

ستیہ گرہ اور خلافت تحریک کے لیے بی اماں کے ساتھ کروڑوں روپے کا چندہ جمع کیا اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کی ممبر بنیں۔ امجدی بیگم کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 29 نومبر 1961 کے ینگ انڈیا میں گاندھی جی نے ان پر ایک بہادر خاتون کے عنوان سے خصوصی مضمون لکھا۔

پاربتی گری(Parbati Giri): پاربتی گری صرف 16 سال کی تھی، جب وہ تمام آزادی کی

سرگرمیوں خصوصاً ہندوستان چھوڑو تحریک میں پیش پیش رہیں۔ مختلف تحریکوں میں شمولیت کی وجہ سے انھیں دو سال کے لیے جیل جانا پڑا۔ آزادی کے بعد پاربتی گیری نے عوامی سطح پر معاشرتی خدمات انجام دیں۔ ان کے کارناموں کی وجہ سے انھیں مغربی اڑیسہ کی MotherTeresa کہا جاتا ہے۔

نشاط النساء بیگم (Nishat Un Nissa Begum):

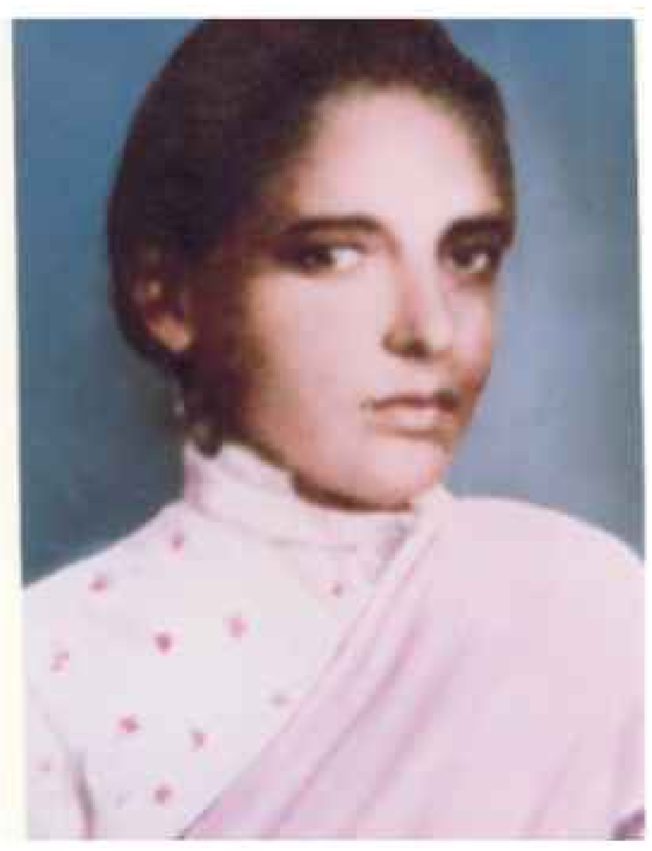

نشاط النساء بیگم نے بیسویں صدی کے اوائل میں اپنے شوہر حسرت موہانی کے ساتھ تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا اور اپنی پوری زندگی ملک وملت کی بہبودی کے لیے صرف کر دی۔ شادی کے صرف پانچ برس بعد حسرت موہانی کی پہلی گرفتاری اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون کی اشاعت پر ہوئی اور جب ان کی دوسری گرفتاری عمل میں آئی تو نشاط النساء کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ انھوں نے سماج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے پردہ ترک کر دیا۔ قید و بند کے درمیان وہ حسرت موہانی کو اخبارات و مکاتیب پہنچا کر حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے وقت وزیر لارڈ ماٹینگو نے سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ دیگر خواتین کے ہمراہ نشاط النساء بیگم بھی ان سے ملیں اور وزیر ہند کے سامنے آزادی کا پیغام ان الفاظ میں رکھا، جب کہ باغیان آئر لینڈ کو رہا کر دیا گیا ہے تو نظر بندان ہند کو بھی آزاد فرما دیجیے۔

بھوگیشوری پھکنانی(Bhogshwari phukanani):

بھوگیشوری آسام کی رہنے والی ایک گھریلو خاتون تھیں لیکن ملک کی محبت نے اسے ایک نڈر لیڈر بنا دیا۔ انھوں نے اپنے علاقے میں بڑے پیمانے پر جلسوں اور بغاوتوں کی قیادت کی۔ جب عورت کو

صرف گھر کی نگہداشت سمجھا جاتا تھا تو بھوگیشوری نے مقامی سطح پر برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج کرنا شروع کیا اور اپنے بچوں کو تحریک آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ انڈین نیشنل کانگرس کے برہم پور آفس پر برطانوی حکام نے قبضہ کر لیا تھا۔ 1942 میں انقلابیوں نے اس دفتر کو واپس اختیار میں لے لیا۔ جب ہندوستانی انقلابیوں نے دفتر کی بازیابی میں جشن کا اعلان کر دیا تو برطانوی حکام نے بدلہ لینے کے لیے کپتان فنش کے ساتھ اپنی فوج بھیج دی۔ خوشگوار ماحول نے سنگین حالت اختیار کر لی اور پورے علاقے میں وندے ماترم کی بازگشت ہونے لگی۔ جوں ہی بھوگیشوری حالات سے باخبر ہوئیں، وہ کپتان فنش سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہجوم لے کر آ گئیں۔ کپتان فنش نے اس کے ہاتھ سے قومی جھنڈا چھین کر زمین پر گرا دیا۔ بھوگیشوری کو جھنڈے کی بے حرمتی برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے کپتان کے سر پر جھنڈے کے کھمبے سے حملہ کر دیا۔ غصے میں کپتان فنش نے بھوگیشوری پر فائرنگ کر دی۔ سچی محبّ وطن

بھوگیشوری نے ترنگے کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔

> **شیر دل خواتین کی طرح ہزاروں نا معلوم خواتین ہیں جو مادر وطن کے لیے قربان ہو گئیں جنھوں نے آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنے شوہروں، والدین اور بھائیوں کو طعنے دیے اور ان کی غیرت کو جگایا۔ جنگ آزادی کے دوران جن بہادر خواتین نے ملک کو انگریزی حکومت کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کے حوصلے قابل تحسین ہیں۔**

زلیخا بیگم(Zulaikha Begum): زلیخا بیگم (زوجہ مولانا ابوالکلام آزاد) بھی ایسی ہی خاتون ہیں جنھوں نے بی اماں، امجدی بیگم، بھیکا جی کاما، نشاط النساء بیگم کی طرح مردوں کے شانہ بہ شانہ سیاسی جلسوں کے اسٹیج پر آکر آزادی کی جنگ میں براہ راست حصہ تو نہیں لیا لیکن ہر طرح کی معاشی سختیوں، ذہنی الجھنوں، اور دوسری پریشانیوں کے باوجود اپنے شوہر کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے بارے میں عام لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ وہ نہ کبھی اسٹیج پر آئیں، نہ پردے سے باہر نکلیں اور نہ ہی اخبارات کی سرخیوں میں انھیں جگہ ملی لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے در پردہ اپنے محبوب کی خدمت کر کے ان کے علمی و عملی کارناموں میں سکون و اطمینان کی جو فضا قائم کی اس کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہر سا تو اں دن جیل میں اور باقی ایام دوڑ دھوپ میں صرف ہوتے رہے۔ انھوں نے اپنے تمام زیورات مولانا کے حوالے کر دیے تا کہ ان سے حاصل کردہ رقم سے جنگ آزادی میں نئی روح پھونکی جا سکے۔

راج کماری گپتا(Rajkumari Gupta): راج کماری گپتا اور ان کے شوہر نے مہاتما گاندھی اور چندر شیکھر آزاد کے ساتھ اہم کام کیے۔ انھوں نے کاکوری کیس میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ راج کماری کو ایک آپریشن میں شامل افراد کو ریوالور فراہم کرانے کی ڈیوٹی تھی۔ وہ تین سال کے بیٹے کو ساتھ لے کر اپنی پوشاک میں چھپائے اسلحہ بانٹنے گئی تھیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ انھیں گرفتار کرنے کے ساتھ گھر سے بھی محروم کر دیا۔

تارا رانی شریواستو(Tara Rani Shrivastava):

تارا رانی کو اپنے شوہر کے ہمراہ سیون تھانے کے سامنے جلوس کی قیادت کرتے وقت گولی مار دی گئی لیکن وہ اپنے زخموں پر پٹی باندھ کر آگے چلتی گئیں اور واپس لوٹتے وقت تا تارانی کی موت ہو گئی۔ تاہم ان کے اندر آزادی کا جذبہ اتنا مضبوط تھا کہ وہ قومی جھنڈے کو تب تک اوپر اٹھاتی رہیں جب تک ان کی جان نہ نکل گئی۔

(Durgabai Deshmukh) درگا بائی دیشمکھ: درگا بائی

آندھرا پردیش کی ایک عظیم مجاہدہ آزادی، سماجی کارکن، ماہر وکیل اور پہلے ہندوستانی ریزرو بینک کے گورنر چشن دیشمکھ کی رفیقۂ حیات تھیں۔ وہ مہاتما گاندھی سے بہت متاثر تھیں۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور متعدد ستیہ گرہ تحریکوں کی قیادت کی۔ وہ Constituent Assembly اور Planning Commission of India کی ممبر تھیں۔ دوسرے کارکنوں کے برعکس وہ ساری زندگی عورتوں کے حقوق کے لیے لڑتی رہیں۔ وہ خود پریشانیوں سے دوچار ہوئیں لیکن بے شمار ہندوستانی خواتین کی زندگی کو بدلنے اور انھیں وقار سے جینے کے لیے برابر جدوجہد کرتی رہیں۔

کماری پریتی لتا دا دیکر (Kumari Preeti Lata Dadekar): کماری پریتی لتا دادیکر بنگال کی رہنے والی پرعزم خاتون تھیں۔ انھوں نے تیسری دہائی میں سرجیہ سین کی قیادت میں

چاٹگام پر انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اور گرفتاری کے بجائے خودکشی کو ترجیح دی تھی۔

کنیزہ سیدہ بیگم (Kaniza sayeda Begum): کنیزہ سیدہ بیگم دوسری بہادر خواتین کی طرح سودیشی تحریک میں شامل رہیں اور کانگرس کے جلسوں میں حصہ لے کر تحریک آزادی کو آگے بڑھاتی رہیں۔

راج کماری امرت کور (Raj Kumari Amrit Kaur): راج کماری امرت کور ہندوستان کی پہلی وزیر صحت، مجاہدہ آزادی اور سماجی خدمت گار تھیں۔ امرت کور کے والد راجا ہرنام سنگھ کے گھر گوپال کرشن گوکھلے جیسے رہنماؤں کی آمد ورفت سے

امرت کو بھی جنگ آزادی سے دلچسپی ہونے لگی۔ وہ 1919 میں گاندھی جی سے ملیں وہ ان کے نظریات اور ملک کے تہیں نقطہ نظر سے خاصی متاثر ہوئیں۔ انھوں نے جنگ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1930 میں ڈانڈی مارچ میں شریک ہونے کی وجہ سے انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔

صغریٰ خاتون (Sugra Khatoon): لکھنؤ میں جب تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی تو صغری خاتون بھی آزادی کی تحریک میں سرگرم عمل ہوئیں۔ وہ سروجنی نائیڈو، شریمتی موتی لال نہرو اور دوسری خواتین کے ساتھ سبھی زنانہ مجلس میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ باوجود پردہ پوشی کے ستیہ گرہوں میں پیش پیش رہتی تھیں۔ جب بی اماں لکھنو چندہ اکٹھا کرنے آئیں تو وہ ایک تخت پر بیٹھ گئیں اور ان کے سامنے ایک چکور کپڑا بچھا دیا گیا۔ سب سے پہلے صغری بیگم نے اس پر اپنے سارے زیورات لا کر رکھ دیے جو کچھ پچاس تولے سونا اور اور کچھ جواہرات پر مشتمل تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک پر جوش تقریر کی۔ اس تقریر کا ایسا اثر ہوا کہ وہاں موجود سبھی خواتین نے اپنا سب کچھ لا کر چندے میں دے دیا۔

بیگم خورشید خواجہ (Begum Khurshed Khaja): بیگم خورشید حیدرآباد کے چیف جسٹس سر بلند جنگ کی بیٹی اور جنگ آزادی کے نامور مجاہد خواجہ عبدالمجید کی اہلیہ تھیں۔ حیدرآباد میں قیام کے دوران مسز سروجنی نائیڈو کے افکار و خیالات سے کافی متاثر ہوئیں۔ بیگم خورشید نے پردہ ترک کر کے قوم پرست شوہر کے شانہ بہ شانہ چلنے کا فیصلہ کیا۔ نیز اس مشکل ترین راہ میں ہر قسم کی ذہنی و معاشی پریشانیوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئیں۔ خورشید بیگم 1960 میں انڈین نیشنل کانگریس کی ممبر بنیں اور تاحیات اسے برقرار رکھا۔

اوپر بیان کی گئی شیر دل خواتین کی طرح ہزاروں نا معلوم خواتین ہیں جو مادر وطن کے لیے قربان ہوگئیں جنھوں نے آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنے شوہروں، والدین اور بھائیوں کو طعنے دیے اور ان کی غیرت کو جگایا۔ جنگ آزادی کے دوران جن بہادر خواتین نے ملک کو انگریزی حکومت کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے تکلیفیں اٹھائی ہیں ان کے حوصلے قابل تحسین ہیں۔ ہمارا قومی فریضہ ہے کہ یوم آزادی کی 78 ویں سالگرہ پر ان بہادر خواتین کی خدمات کو یاد کر کے انھیں خراج تحسین پیش کریں۔ اس لیے کہ ان کی قربانیاں آج تاریخ کے صفحات میں کہیں گم ہوگئیں ہیں۔

Bilkees Maqbool
Research Scholar
Aligarh Muslim University
4/357 A Hathi Dooba
Near Zoheb Apartment
Aligarh 202002(U.P)

درخشاں تاجور

علم کا سمندر
مجنوں گورکھپوری

جدید اردو ادب کے معماروں میں ایک نمایاں اور ممتاز نام مجنوں گورکھپوری کا ہے۔ انھوں نے تقریباً پچاس سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ مجنوں گورکھپوری نے شعرو شاعری بھی کی، ناول اور افسانے بھی لکھے، مکتوب نگاری اور تنقید نگاری بھی کی ، صحافتی ذمے داریاں بھی نبھائیں اور دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ ادبی اور تنقیدی موضوعات پر ان کی تحریریں سند کا درجہ رکھتی ہیں اور ان میں سے بیشتر اعلیٰ درسگاہوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ اگر وہ اپنے ایک شعر میں یہ دعویٰ کرتے ہیں تو کوئی مبالغہ نہیں کہ۔

وہ پائی ہے نگہِ حسنِ آفریں میں نے
بنا دیا ہے ہر اک چیز کو حسیں میں نے

علم و ادب مجنوں گورکھپوری کو وراثت میں ملا تھا۔ ان کے والد محمد فاروق دیوانہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر تھے۔ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ ان کی کتابوں کے نام ’قیل و قال‘ اور ’مطالعہ فطرت‘ ہیں۔ انھوں نے ’آئینہ‘ نام کا اخبار بھی جاری کیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انھیں اپنے اخبار ’ہمدرد‘ کا سب ایڈیٹر بنایا تھا۔ مجنوں گورکھپوری کے دادا لعل محمد اور پردادا مدار بخش بھی تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی دادی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں اور انھیں عربی، فارسی اور ہندی زبان پر عبور حاصل تھا۔

مجنوں گورکھپوری کی پیدائش موضع پلدہ عرف ملکی جوت تحصیل خلیل آباد ضلع بستی میں 10 مئی 1904 کو ہوئی۔ میٹرک کا امتحان انھوں نے 1921 میں مشن ہائی اسکول گورکھپور اور انٹر کا امتحان 1927 میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے پاس کیا۔ 1929 گریجویشن سینٹ اینڈ یوز کالج گورکھپور سے کیا۔ 1934 میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں اور 1935 کلکتہ یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کی ابتدا انھوں نے سینٹ اینڈریوز کالج میں انگریزی استاد کی حیثیت سے کی۔ وہاں انھوں نے 1932 سے 1935 تک اپنی خدمات انجام دیں۔ جولائی 1936 سے مئی 1937 تک وہ اسلامیہ کالج گورکھپور میں انگریزی اور اردو کے استاد رہے۔ ستمبر 1958 میں ایک مرتبہ پھر ان کا تقرر انگریزی اور اردو لکچرر کی حیثیت سے سینٹ اینڈریوز کالج میں ہوا۔ اسی سال جب گورکھپور یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ قائم ہوا تو وہ وہاں کے صدر شعبہ بنائے گئے۔ مجنوں صاحب وہاں بہ حیثیت لکچرر کام کر رہے تھے۔ ان کی خواہش ریڈر ہونے کی تھی لیکن ان کا یہ خواب پورا نہیں ہو سکا جس کی وجہ سے اس شہر کو جس سے انھیں بہت لگاؤ تھا چھوڑنا پڑا۔

گورکھپور سے کبیدہ خاطر ہونے کے بعد انھوں نے علی گڈھ کا رخ کیا۔ وہاں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں انھیں ریڈر کا عہدہ مل گیا۔ مئی 1968 تک وہ علی گڈھ میں رہے۔ 1968 میں وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے کراچی یونیورسٹی میں 1978 تک اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ کراچی میں ہی 6 جون 1988 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

مجنوں گورکھپوری کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں جن کی حصے داری رہی ان سب کا ذکر انھوں نے اپنی خودنوشت میں کیا۔ ان کے مطابق ریاض خیر آبادی، مہدی افادی، حسرت موہانی، محمد علی جوہر، جواہر لال نہرو، تارا چند، امرناتھ جھا اور رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری نے ان کی شخصیت پر اثر ڈالا اور ان کی دماغی صلاحیتوں کی جی بھر کر داد دے کر ان کے حوصلوں کو توانائی بخشی۔ لیکن بقول مجنوں جن دو شخصیتوں نے ان کی کردار سازی میں اہم کردار ادا کیا ان میں ایک تو ان کی دادی مرحومہ تھیں اور دوسری جمیلہ بیگم تھیں جو مہدی افادی کی بڑی بیٹی تھیں اور ان کے برادر نسبتی محمد ذکی سے منسوب تھیں۔

مجنوں گورکھپوری نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شعروشاعری سے کی۔ وہ مرزا بیدل اور غالب کی شاعری کے گرویدہ تھے اور میر کی استادی کے بھی قائل تھے۔ انھوں نے ابتدا میں اپنے استاد مولوی عباس قاصر سے شعروشاعری کے گُر سیکھے لیکن اصلاح کسی سے نہیں لی۔ اس وقت گورکھپور میں شعروادب کی محفلیں اکثر و بیشتر باذوق لوگ آراستہ کرتے رہتے تھے جن میں ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، فراق گورکھپوری کے علاوہ مقامی شعرا بھی شریک ہوتے تھے۔ ان شعری محفلوں میں بجائے مصرعہ طرح کے پورا شعر دے دیا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک محفل میں ریاض خیر آبادی کا یہ شعر دیا گیا۔

جسے تم کوستے ہو عمر اس کی اور بڑھتی ہے
تمھیں سب کچھ تو آیا کوسنا اب تک نہیں آیا

اس شعر پر مجنوں نے جو غزل کہی اسے خوب داد ملی۔ چند اشعار پیش خدمت میں۔

وہ کہتے ہیں سلیقہ عشق کا اب تک نہیں آیا
نگاہ شوق تجھ کو دیکھنا اب تک نہیں آیا
مزاجِ حسن پہنچا اعتنا سے کم نگاہی تک
زباں پر میری حرف مدعا اب تک نہیں آیا
بہاریں کتنی آئیں کتنے مرغانِ چمن آئے
گل خونیں نوا کا ہم نوا اب تک نہیں آیا
جہاں میں کتنے آئے پیکرِ خوبی و محبوبی
مگر اے دوست اس کا دوسرا اب تک نہیں آیا

مجنوں کا کلام اس زمانے کے جن مقتدر رسالوں میں شائع ہوا، ان کے نام ہیں مشرق (گورکھپور) صلائے عام (دہلی) نگار (بھوپال اور لکھنؤ) ادیب اردو (لکھنؤ) زمانہ (کانپور) شمع (آگرہ) اور آئینہ (الٰہ آباد)۔ مجنوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں اور رباعیاں بھی لکھیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو جو ایوان (گورکھپور، شمارہ نومبر دسمبر 1931) میں شائع ہوئی۔

اک کھیل تھا جس کو زندگانی سمجھے دنیا کو جائے کامرانی سمجھے
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھے اللہ رے فریب سیمیائے ہستی

انھوں نے جو نظمیں کہیں ان میں بلبل، شہر خموشاں، دل سے خطاب، صحبت پارینہ کی یاد میں۔ ایک عورت کے جذبات پر نمائندہ نظمیں ہیں جو کافی مشہور ہوئیں۔ ان میں سے ایک بلبل بہت اہم نظم ہے۔

مجنوں گورکھپوری بہت کم عمری سے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ 1919 کی گرمیوں میں گورکھپور کے ایک مشاعرے میں ان کی ملاقات فراق گورکھپوری سے ہوئی اور جلد دوستی میں بدل گئی اور تا عمر قائم رہی۔ فراق گورکھپور آتے تو وہ اپنے آبائی مکان لکشمی بھون کی جگہ مجنوں کے گھر ٹھہرتے اور مجنوں جب بھی الٰہ آباد جاتے تو وہ فراق کے یہاں قیام کرتے۔ مجنوں یہ اعتراف کرتے تھے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ حاصل کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس کا تجزیہ تفصیل کے ساتھ کیا جائے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کیا حاصل کیا تو ایک دفتر تیار ہوسکتا تھا۔ مجنوں فراق کی ذہانت سے حد درجہ متاثر تھے، جس کا ذکر انھوں نے اپنے مضمون

فراق گورکھپوری میں کیا ہے۔ جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ ”فراق جیسی آٹھ کپاری یا جامع شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوا کرتیں۔ فراق بھی مجنوں کی شخصیت سے حد درجہ متاثر تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”پروار کے تمام مرد عورتوں سے محبتوں کے تعلقات نہایت شگفتہ ہیں۔ وہ ایک سعادت مند فرزند، محبت کرنے والے بھائی، پرخلوص شوہر اور پرشفقت باپ ہیں۔ انتہائی سنجیدہ ہونے کے باوجود ان میں شرارت آمیز ظرافت بھی ہے۔“ (ارمغان مجنوں، مرتبہ صہبا لکھنوی، شبنم رومانی، 257)

> **”مجنوں گورکھپوری نے ادب کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ ان کی نظمیں اور غزلیں اگرچہ مقبولیت کا شرف حاصل کر رہی تھیں لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ انھیں نثر نگاری کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے لہٰذا انھوں نے نثر کو اپنا وسیلۂ اظہار بنانا شروع کیا۔ انھوں نے متعدد مضامین لکھے جو اُس دَور کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ جمیلہ بیگم جو مہدی افادی کی بڑی بیٹی تھیں، کی تحریک پر افسانے لکھنے لگے۔“**

مجنوں گورکھپوری نے ادب کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ ان کی نظمیں اور غزلیں اگرچہ مقبولیت کا شرف حاصل کر رہی تھیں لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ انھیں نثر نگاری کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے لہٰذا انھوں نے نثر کو اپنا وسیلۂ اظہار بنانا شروع کیا۔ انھوں نے متعدد مضامین لکھے جو اُس دَور کے رسالوں میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ جمیلہ بیگم جو مہدی افادی کی بڑی بیٹی تھیں، کی تحریک پر افسانے لکھنے لگے۔ مجنوں گورکھپوری کے مطابق ایک دن جمیلہ بیگم نے ان سے نیاز فتح پوری کے افسانے 'شہاب کی سرگذشت' کی تعریف کی جس کے جواب میں مجنوں گورکھپوری نے نیاز کے اسلوب کی تو تعریف کی لیکن اس افسانے پر کچھ تنقید بھی کی جس پر جمیلہ بیگم نے طنزیہ کہا کہ ”یہ سب نہ لکھنے کی باتیں ہیں“ اسے مجنوں نے ایک چیلنج سمجھا اور ایک افسانہ 'زیدی کا حشر' کا ایک حصہ اسی رات ایک نشست میں لکھ ڈالا۔ دوسرے دن جمیلہ بیگم کو اس افسانے کا کچھ حصہ سنایا تو انھوں نے مسکرا کر کہا کہ میں جانتی تھی کہ تم لکھ سکتے ہو۔ دو تین ہفتے کے بعد نیاز فتح پوری گورکھپور آئے تو جمیلہ بیگم سے اس افسانے کا ذکر سنا اور نامکمل مسودہ ان سے لے کر پڑھا۔ انھوں نے مجنوں سے یہ وعدہ لیا کہ وہ اسے مکمل کر دیں وہ اسے نگار میں قسط وار چھاپیں گے اور اس طرح یہ افسانہ 'نگار' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے 'گہنا' اور پھر 'سمن پوش' لکھا۔ یہ افسانے بھی نگار میں شائع ہوئے۔ اس طرح مجنوں گورکھپوری نے افسانہ نگاری کی دنیا میں قدم رکھا۔

مجنوں گورکھپوری کا اصل میدان تنقید تھا۔ انھیں جب اس بات کا ادراک ہوا تو وہ تنقید نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ ان کی پہلی ادبی تنقید زہر عشق پر تھی جو زہر عشق کے مقدمے کے طور پر شائع ہوئی۔ ان کا دوسرا تنقیدی مضمون 'میر اثر: خواب و خیال' جو جنوری 1931 کے ایوان میں شائع ہوا۔ 1931 کے ایوان میں ہی قسطوں میں ان کا طویل مقالہ 'تاریخ جمالیات' شائع ہوا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا اور بہت سی یونیورسٹی کے نصاب میں اس کتاب کو شامل کیا گیا۔ مجنوں کی تنقیدی تحریروں میں پردیسی کے خطوط بھی ایک اہم کتاب ہے جس میں فرضی شخصیتوں کے نام خطوط شامل ہیں اور جو بظاہر افسانے معلوم ہوتے ہیں لیکن خطوط کی شکل میں انھوں نے تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے تنقید کی ابتدا تاثراتی تنقید سے کی لیکن بعد میں انھوں نے سائنٹفک تنقید کو اپنا لیا اور تنقید کے موضوع پر لاتعداد کتابیں تحریر کیں اور بہت شہرت اور ناموری حاصل کی۔

مجنوں تمام عمر زیست کو راہ سفر مان کر چلتے رہے اور لگاتار سرگرم عمل رہے۔ ان کی نمائندہ تنقیدی کتابوں کے نام ادب و زندگی،

دوش و فردا، نکات مجنوں، شعر و غزل، غزل سرا، غالب۔ شخص اور شاعر، تاریخ جمالیات، پردیسی کے خطوط اور نقوش و افکار ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں کے نام ہیں خواب و خیال، سمن پوش، نقش ناہید اور مجنوں کے افسانے۔ انھوں نے بچوں کے لیے ایک کتاب ہندوستان کی بہادر عورتیں بھی تحریر کی۔ انھوں نے زہر عشق (مرزا شوق کی مثنوی) اور حسن فطرت (عبرت گورکھپوری) کو مرتب بھی کیا۔ انھوں نے گورکھپور سے ایوان کے نام سے ایک خالص ادبی اور ثقافتی رسالہ نکالا۔ مجنوں گورکھپوری کو پانچ زبانوں اردو، ہندی، انگریزی عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ ان کی نظر مغربی ادبیات پر بھی گہری تھی۔ انھوں نے دوسری زبانوں کے اعلیٰ ادب کو اردو میں منتقل کر کے اسے مالا مال بھی کیا۔ ان کی کچھ ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے نام ہیں آغاز ہستی (برنارڈ شا) الوالخمر (طالستائی) سالوی (آسکر وائلڈ) قابیل (بائرن) کنگ لئر (شیکسپیئر) شمسون مبارز (ملٹن) مریم مجدلانی (مارس ماہتر لنک) اور سنگھاسن بتیسی (ہندی کی لوک کہانیاں)۔ مجنوں کو اپنے ملک سے بے پناہ محبت تھی۔ خاکِ وطن سے انھیں جو عقیدت و انسیت تھی اس کا اظہار ان کی تحریروں میں جابجا دکھائی پڑتا ہے۔

مجنوں مادرِ وطن کو زنجیر غلامی میں جکڑا دیکھ سخت رنجیدہ رہتے تھے۔ وہ اسے آزاد دیکھنے کے متمنی تھے ان کے مطابق جب وہ اسکول میں تھے تو اسکاؤٹ میں تھے لیکن انھوں نے اسکاؤٹ کو صرف اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ انھیں یونین جیک کو سلامی دینا ناگوار گذرتا تھا۔ مجنوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ان کی انگریز دشمنی دیکھ کر ان کے ایک انگریز پرنسپل نے جب ان سے کہا کہ احمد صدیق ہم کو اس کا بہت دکھ ہے کہ تم ہم لوگوں سے نفرت کرتے ہو تو مجنوں نے بے جھجک انھیں جواب دیا۔

ملک میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی چیرہ دستیاں اور ریشہ دوانیاں انھیں بے چین کرتی تھیں اس لیے وہ ان زیادتیوں کے خلاف اپنی آواز بھی بلند کرتے رہتے تھے۔

نہیں غم سر کے کٹنے کا کہ اطمینان ہے قاتل
مذاق سرفروشی ہے تو پھر کرلیں گے سر پیدا

مجنوں سیاسی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ لیکن ان کی یہ سرگرمیاں ان کی ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد رفتہ رفتہ کم ہوئیں پھر انھوں نے ان سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

ملک کے بٹوارے کا درد مجنوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا انھوں نے خون خرابے کا جو دور دیکھا اس نے ان کی روح تک مجروح کر دیا اور اور اس کا اثر ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر پڑا۔

بٹوارے کے بعد افراتفری کے دَور میں ہی انھوں نے پردیسی کے خطوط لکھے اور ان میں ان کے دلی کرب کی عکاسی جابجا ہوئی ہے۔ احمد صدیق مجنوں گورکھپوری تمام عمر درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہے۔ وہ اپنے طلبا میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ مجنوں اپنے طلبا سے مشفقانہ برتاؤ کرتے اور تحفے میں انھیں کتابیں بھی دیتے۔

ایک اچھے استاد کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنی صلاحیت اور نرم گفتاری کو بڑے غیر محسوس طریقے سے اپنے طلبا میں منتقل کر دے۔ مجنوں گورکھپوری نے بہ حیثیت استاد ایسا کیا بھی۔ جنھوں نے بھی گورکھپور کے ہندی کے ایک بڑے ناقد پروفیسر پرمانند شریواستو کو دیکھا ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ وہ بھی مجنوں ہی کی طرح ایک بڑے قلم کار اور شفیق استاد تھے۔ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ مجنوں کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے استاد سے جڑی یادوں کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے تھے اور انتہائی عقیدت اور احترام کے ساتھ یہ اعتراف کرتے تھے کہ ان کی تربیت میں مجنوں گورکھپوری کی حصے داری رہی ہے۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب 'میرے ساکچھا تکار' میں بھی کیا ہے۔

❑❑❑

Dr. Darakhshan Tajwar
C/o, Mr. Imtiyaz Ahmad Abbasi (Advocate)
Saudagar Mohalla
Near Madarsa Chauraha
Po.: Gita Press
Gorakhpur- 273005 (UP)
amirali2525000@gmail.com

سر سید کے رفیق کار
علامہ شبلی نعمانی

شاذیہ عمیر

علامہ شبلی نعمانی ایک ایسے مینارۂ نور کی طرح ہیں جس کی روشنی دور ہی سے آنکھوں کو خیرہ اور دلوں کو مسرور کرتی چلی جاتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ قدرت نے انھیں صرف ستاون سال کی عمر بخشی (1857-1914) لیکن اتنے مختصر عرصے میں انھوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جس کے لیے صدیاں درکار ہیں۔

سر سید سے شبلی کی پہلی ملاقات محض 25 سال کی عمر میں اس وقت ہوئی جب وہ اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے علی گڑھ کالج گئے۔ غائبانہ طور پر وہ سر سید کے قومی کارنامے سے اس طور متاثر تھے کہ عربی میں ان پر لکھا ہوا ایک قصیدہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ سر سید نے جب یہ قصیدہ سنا تو ان کی علمیت اور ذہانت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے کالج میں پروفیسر کے لیے انھیں منتخب کرلیا۔ یکم فروری 1883 کو علی گڑھ کالج سے شبلی کی ملازمت کا آغاز ہوا اور تقریباً سولہ سال تک اس سے وابستہ رہے۔ اس قیام نے شبلی کی ذات و کائنات کو ایک ایسی جہت عطا کی جس نے ان کی پوری زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ گھنٹوں سر سید سے علمی و ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے اور ردو قبول کی کیفیت انھیں سرشار کردیتی۔

سر سید کا کتب خانہ جس میں عربی فارسی کی نادر و نایاب کتابوں کے علاوہ تاریخ اور جغرافیہ کی بعض ایسی کتابیں بھی تھیں جو جرمنی سے چھپی تھیں اور ہندوستانی علما جن کے نام سے بھی واقف نہیں تھے سر سید نے بغیر کسی پس و پیش شبلی کو اس سے استفادے کی اجازت دے دی۔ نتیجہ یہ کہ شبلی کے شب و روز اس لائبریری کی معیت میں بسر ہونے لگے اور جب سر سید کا انتقال ہوا تو کتب خانے کی چابی شبلی کے پاس تھی۔

سر سید نے شبلی کو آنحضرتؐ کی ذات سے دلچسپی کے لیے راغب کیا۔ انھوں نے فرمائش کی کہ وہ آنحضرت پر عربی میں ایک کتاب لکھ دیں جسے علی گڑھ کے دینی نصاب میں شامل کیا جا سکے۔ لہٰذا سر سید کی خطبات احمدیہ سے متاثر ہوکر انھوں نے سیرت النبیؐ لکھی لیکن رفتہ رفتہ شبلی کا منطقی ذہن اور ان کی ذات کی انفرادیت نے اپنی راہ الگ بنانا شروع کردیا۔ نتیجہ وہ سر سید کے تعلیمی مشن اور عصری علوم و آگہی کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے لگے۔ انھیں یہ بات بے قرار کرنے لگی کہ جدید تعلیم نوجوانوں کو اپنے مذہب، تہذیب اور تاریخ سے بے نیاز نہ کردے۔ وہ سوچنے لگے کہ ایسا نصاب تیار کیا جائے جس سے قدیم اور جدید دونوں طرح کی تعلیم ممکن ہو سکے۔ دارالمصنّفین اعظم گڑھ اور شبلی کالج ان کی اسی فکر کا عکس ہے لہٰذا ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی شبلی کا نام اور کام زندہ و جاوید رہے گا۔ اگرچہ ابتدا میں شبلی سائنسی تعقل اور مغربی افکار و نظریات کو مشکوک نظروں سے دیکھتے رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کی اہمیت سمجھنے لگے اور سر سید کی دور اندیشی و ذہانت کے قائل ہونے لگے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے 'صبح امید' کے نام سے خصوصی طور پر ایک ایسی مثنوی لکھی جس میں کھلے دل سے سر سید کی خدمات کا اعتراف کیا۔

اس شان سے وہ آیا دلگیر — پہلو میں اثر دل میں تاثیر
صورت سے عیاں جلال شاہی — چہرے پہ فروغ صبح گاہی

وہ ملک پہ جان دینے والا   وہ قوم کی ناؤ کھینے والا

اس سے واضح ہوتا ہے کہ تمام اختلافات کے باوجود سرسید کی شخصیت اوران کے تعلیمی وسماجی کارنامے سے شبلی بے حد متاثر تھے۔ شبلی کی بے قرار طبیعت اور اپنی راہ الگ بنانے کی خو نے انھیں کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ تمام عمر وہ قریہ قریہ خاک چھانتے رہے۔ لہٰذا طبیعت کی جولانی نے جب ادب کے میدان میں قدم رکھا تو یہاں بھی ایسا نقش قائم کیا جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ بیک وقت شاعر، انشاپرداز، سوانح نگار اور ناقد کی حیثیت سے جب ہمارے سامنے آتے ہیں تو حیرت واستعجاب کی کیفیت ہم پر طاری ہوجاتی ہے۔ شاعری کا شوق انھیں بچپن سے ہی تھا۔ ابتدا میں فارسی میں شعر کہا کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ قوم کے درد نے قومی اور اصلاحی شاعری کی طرف ان کا رخ موڑ دیا اور اردو میں شعر کہنے لگے۔

شبلی کی عظمت یہ ہے کہ ان کے دل میں قوم کی اصلاح اور سنوارنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ ان کا ذہن تقابلی تھا۔ وہ نئی نسل کا تقابل اسلاف سے کرا کے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ہم میں آخر کیا کمی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے الفاروق، المامون، النعمان، الغزالی اور سوانح مولانا روم جیسے مشاہیر اسلام پر قلم اٹھا کر قوم کے سامنے ایسی مثال پیش کی جو ان کے عقیدے اور عمل کو صحیح سمت دے سکے۔ نوجوانوں کے سوئے ہوئے ضمیر کو جگانا اور اسے باعمل بنانا ہی شبلی کا اصل منشا تھا۔ وہ ایک طرف شاندار ماضی کے ورثے کی یاد دلانا چاہتے تھے تو دوسری طرف باطل کے طوفانوں کا رخ پھیر دینے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ اس کے لیے تاریخ اسلام کا زریں عہد پلٹتے گئے اور دکھاتے گئے کہ ہمارے اسلاف کا گفتار و کردار کیسا تھا۔

الفاروق لکھنے کے لیے انھوں نے مصر، شام اور ترکی کا سفر کیا۔ تین ماہ قسطنطنیہ میں رہے۔ وہاں کی تقریباً ہر کتب خانے کی نایاب کتابیں دیکھیں۔ اس کے لیے وہ روزانہ تین چار میل پیدل چلتے تھے۔ اس سے مولانا کی محنت، جاں فشانی اور قوم کے تئیں ہمدردی کا جذبہ پوری طرح عیاں ہوجاتا ہے۔ شبلی کو اندازہ تھا کہ اگر مشاہیر اسلام کے کارنامے خشک اور بے مزہ اسلوب میں بیان کیے جائیں تو قاری کی طبیعت مکدر ہوجائے گی۔ لہٰذا انھوں نے خوش سلیقگی، عمدگی، ندرت، تازگی اور تشبیہات واستعارات سے اپنی تحریر کو ایسا مزین کیا کہ صاحب طرز ادیب میں شبلی کا نام سب سے نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ عربی وفارسی کے جید عالم ہونے کے باوجود نہ ہی انھوں نے ثقیل الفاظ وتراکیب کا سہارا لیا اور نہ ہی کسی نامانوس جملوں کو اپنی نثر میں داخل ہونے دیا بلکہ ان کا اسلوب نگارش، سلاست، فصاحت، متانت وشوکت کے ساتھ اس قدر پروقار اور رعنائی انگیز ہے کہ خشک سے خشک موضوع بھی دلچسپ اور جاندار معلوم ہونے لگتا ہے اور سبک رو دریا کی طرح رواں دواں نظر آتا ہے۔

اردو تنقید کے باب میں اگرچہ شبلی سے قبل حالی کا نام آتا ہے لیکن شاعری کے لیے حالی نے جن شرائط کو ضروری قرار دیا ہے اس سے اختلاف کی کافی گنجائش ہے۔ اگر تمام تخلیق کار شاعری کے پیچ در پیچ علامتی واستعاراتی نظام سے دست کش ہوکر محض سادگی اور اصلیت کے حصار میں مقید ہوجائیں اور مناسب الفاظ کو اس طور ترتیب دیں کہ مخاطب کو شعر کے معنی مقصود کے سمجھنے میں کچھ تردد باقی نہ رہے تو پھر انفرادیت کیا رہ جائے گی۔ نیز ابہام تو شاعری کے لیے حرزِ جاں ہے، جو اسے عمومیت کے باوجود ماورائیت عطا کرتی ہے۔ اگر اس کے گرد یہ پراسرار ہالہ فقط ایک سیدھے سادے بیانیے میں تبدیل ہوجائے تو تخلیق کار، قاری اور ناقد کے لیے اس میں کیا کشش رہ جائے گی۔

تمام اختلافات کے باوجود یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ حالی نے پہلی بار نہ صرف یہ کہ اردو میں نظری تنقید کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا بلکہ غزل، قصیدہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے عملی تنقید کا نمونہ بھی پیش کیا۔ لیکن شبلی کی اہمیت اس بات میں ہے کہ جہاں حالی نے تخیل کو قوت ممیزہ کے زیر اثر کرکے اسے آزاد فضا میں پرواز کی اجازت دینے کے بجائے پابہ زنجیر کردیا تھا وہاں شبلی نے اس کے دائرہ کار کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ اول شاعر جب کسی چیز کا مشاہدہ کرتا ہے یعنی محاکات دوم جب وہ اس محاکات میں اپنے تخیل کی رنگ آمیزی سے کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے، اسے وسعت سے آشنا کیا۔ مزید انھوں نے مصوری اور شاعری میں فرق ظاہر کرتے

ہوئے اس بات کا اعادہ کیا ہے جہاں کوئی مصور کسی شے کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے ایک ایک رگ وریشے کی تصویر کھینچتا ہے وہاں شاعر صرف انھیں کیفیات وتاثرات کی نقاشی کرتا ہے جو انسانی جذبات واحساسات کو برانگیخت کرتے ہیں بقیہ جزئیات یا تو وہ دھندلا کر کے پیش کرتا ہے یا پھر اسے نظر انداز کر دیتا ہے اس لیے شاعری کا مرتبہ مصوری سے بلند ترین ہے۔

دراصل حالی کے برخلاف شبلی ادب کو قومی واصلاحی مشن کے لیے وقف کرنے کے بجائے اس کی مقصود بالذات حیثیت اور شاعری کو عقلی رویے کے تابع کرنے کے بجائے وجدانی انداز نظر کے موید ہیں۔ کہتے ہیں:

''شاعری چونکہ وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس لیے اس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔''1

مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شبلی اپنے عہد کے تقاضے سے صرف نظر کر کے محض دل کے فرمائے ہوئے کو ہی مستند قرار دے رہے تھے بلکہ وہ شاعر کو بندھے ٹکے اصولوں کا تابع مہمل کرنے کے بجائے اسے آزادانہ فضا میں پرواز کی پوری اجازت دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ان کے نزدیک ہر جگہ سادگی اور اصلیت کی وکالت کرنا ایک غیر مستحسن روش ہے کیونکہ ایک جگہ ایک لفظ اگر فصیح ہوتا ہے تو دوسری جگہ وہی لفظ غیر فصیح کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ پھر پوری شاعری کے لیے ایک ہی نوع کا پیمانہ وضع کرنا کہاں تک درست ہے۔ لکھتے ہیں:

''شاعر کے لیے نہایت ضروری ہے کہ فصیح اور مانوس الفاظ کا تفحص کرے اور کوشش کرے کہ کوئی لفظ فصاحت کے خلاف نہ آنے پائے۔ فصاحت کی تعریف اگرچہ اہل فن نے منطقی طور پر جنس وفصل کے ذریعے سے کی ہے یعنی حرفوں میں تنافر نہ ہو، لفظ نادرالاستعمال نہ ہو، قیاس لغوی کے مخالف نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ فصاحت کا معیار صرف ذوق اور وجدان صحیح ہے۔ ممکن ہے کہ ایک لفظ میں تنافر حروف، ندرت استعمال، مخالفت قیاس کچھ نہ ہو باوجود اس کے وہ فصیح نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک لفظ بالکل نادرالاستعمال ہو اور پھر فصیح ہو۔''2

لفظ ومعنی کے بحث میں شبلی نے لفظ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ شبلی نے شاعری کو اصول ونظریات کے سلاسل میں مقید کرنے کے بجائے اس کے جمالیاتی رویے اور وجدانی انداز نظر کو اولین مقام عطا کیا۔ اس طرح شبلی نے اردو تنقید کو ایک ایسی کشادہ فضا اور فراخی نظر عطا کی کہ آگے چل کر اس روش پر بلند وبالا عمارت تعمیر ہوئی۔ بقول عبادت بریلوی:

''شبلی کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے مسلم ہے۔ ان کی نظر میں دقت اور گہرائی ہے۔ جدت اور اپچ ہے اور ان کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں۔ تنقید اور ادبی تجزیے کے میدان میں وہ کسی سے کم اہمیت نہیں رکھتے۔ ان کے جمالیاتی ذوق کی بلندی، ہر شکل میں حسن کے احساس کی صلاحیت اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعے نے ان کو اس مرتبے پر پہنچا دیا ہے، جس پر ان کے زمانے میں کوئی اور نہیں پہنچ سکا۔''3

''موازنہ انیس ودبیر شبلی کے تنقیدی افکار کا عملی نمونہ ہے جس میں رزمیے، المیے اور فطرت نگاری کے عناصر پر انتہائی مفصل گفتگو کی گئی ہے اور پہلی بار مرثیہ گوئی کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں تقابلی تنقید کی مثال موازنہ انیس ودبیر ہے۔''

موازنہ انیس ودبیر شبلی کے تنقیدی افکار کا عملی نمونہ ہے جس میں رزمیے، المیے اور فطرت نگاری کے عناصر پر انتہائی مفصل گفتگو کی گئی ہے اور پہلی بار مرثیہ گوئی کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو میں تقابلی تنقید کی مثال موازنہ انیس ودبیر ہے۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کہ شبلی نے ہر جگہ دبیر پر انیس کو مقدم قرار دیا ہے۔ حالانکہ دبیر کے مرثیوں میں بھی سادگی، سلاست،

جذبات نگاری اور رزم و بزم کی ایسی تصویر کشی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر جب حضرت حسین جام شہادت نوش کر لیتے ہیں اور ان کے لاشے پر حضرت زینب آتی ہیں تو ایک بھائی کے لیے بہن کے جذبات کی عکاسی جس طرح دبیر نے کی ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ اشعار دیکھیے۔

اے شمر پاس بھائی کے آؤں جو تو کہے
بے کل ہے سر میں آ کے اٹھاؤں جو تو کہے
زخموں سے جلتی ریت چھڑاؤں جو تو کہے
چادر بدن کے نیچے بچھاؤں جو تو کہے
پانی تو مل سکے گا نہ زہرا کی جائی کو
آنسو چھڑک کے ہوش میں لاؤں گی بھائی کو

ان اشعار کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ دبیر کو زبان و بیان پر کیسی بے پناہ قدرت تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ شبلی نے جو اعتراضات کیے ہیں کہ دبیر بعض جگہوں پر ایسے بے محل اور خلاف موقع بات کہتے ہیں کہ طبیعت مکدر ہو جائے، اپنی جگہ صحیح ہے مثلاً میدان کربلا میں ایک مسافر کا گزر ادھر سے ہوتا ہے اور امام حسین سے جب ان کا نام پوچھتا ہے تو دبیر ان کی زبان سے یہ جملہ ادا کراتے ہیں:

فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

شبلی لکھتے ہیں خود اپنے آپ کو علیہ السلام کہنا بالکل غیر مناسب ہے۔ اسی جملے کو انیس نے اس طرح ادا کرایا ہے۔

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

اس طرح شبلی نے دبیر کی کمزوریوں پر گرفت کرتے ہوئے انیس کو اول مقام عطا کیا ہے جو کافی حد تک درست ہے لیکن بعض جگہوں پر دبیر کے کلام میں بھی برمحل اور موزوں اشعار کی فراوانی ہے۔ ان سب کے باوجود موازنہ انیس و دبیر کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جو صرف تقابلی تنقید کی اہم دستاویز ہی نہیں بلکہ اردو مرثیے پر ایک ایسی مثالی تصنیف ہے جس کے حوالے کے بغیر اردو مرثیے پر گفتگو ناممکن ہے۔ شبلی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

> ''اردو ادب میں شبلی کی کئی حیثیتیں ہیں وہ بیک وقت ایک عالم، ایک مورخ، ایک سوانح نگار ایک ماہر زبان و لسان، ایک شاعر اور ایک نقاد تھے۔ غرض ان کی شخصیت خاصی پہلودار، متنوع، وسیع اور ہمہ گیر تھی اور اس کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی تنقید عالمانہ ہے اور اس میں ایک تاریخی شعور بھی ملتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کی جھلکیاں اس میں موجود ہیں اس میں زبان و لسان کے مختلف پہلوؤں کی طرف توجہ بھی نظر آتی ہے اور اس میں ایک شاعرانہ زاویۂ نظر بھی اپنی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ انھیں اثرات کی بدولت ان کی تنقید بھی خاصی پہلودار، وسیع اور ہمہ گیر بن گئی۔''4

لہٰذا یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سرسید کے رفقا کار میں علامہ شبلی نعمانی کی حیثیت ایک ایسے جاں باز سپاہی کی ہے جو ہر میدان میں فتح کا علم نصب کرتے چلے جاتے ہیں۔ تاریخ، ادب، سیرت، انشا پردازی، فلسفہ شاعری گویا ایک جہاں بے پایاں ہے جو ان کی ذات میں سمایا ہوا ہے اور جن کے فیض سے ایک عالم سیراب ہو رہا ہے۔

حواشی

1. شعر العجم، جلد چہارم، شبلی نعمانی، معارف پریس، اعظم گڑھ 1988، ص 1
2. ایضاً، ص 67
3. اردو تنقید کا ارتقا، انجمن ترقی اردو، اشاعت سوم 1979، ص 198
4. اردو تنقید کے معمار، خلیل الرحمٰن اعظمی، 1965، انڈین بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 100

□□□

Dr. Shazia Omair
Department of Urdu
Delhi University
Delhi- 110007
drshaziaomair@gmail.com

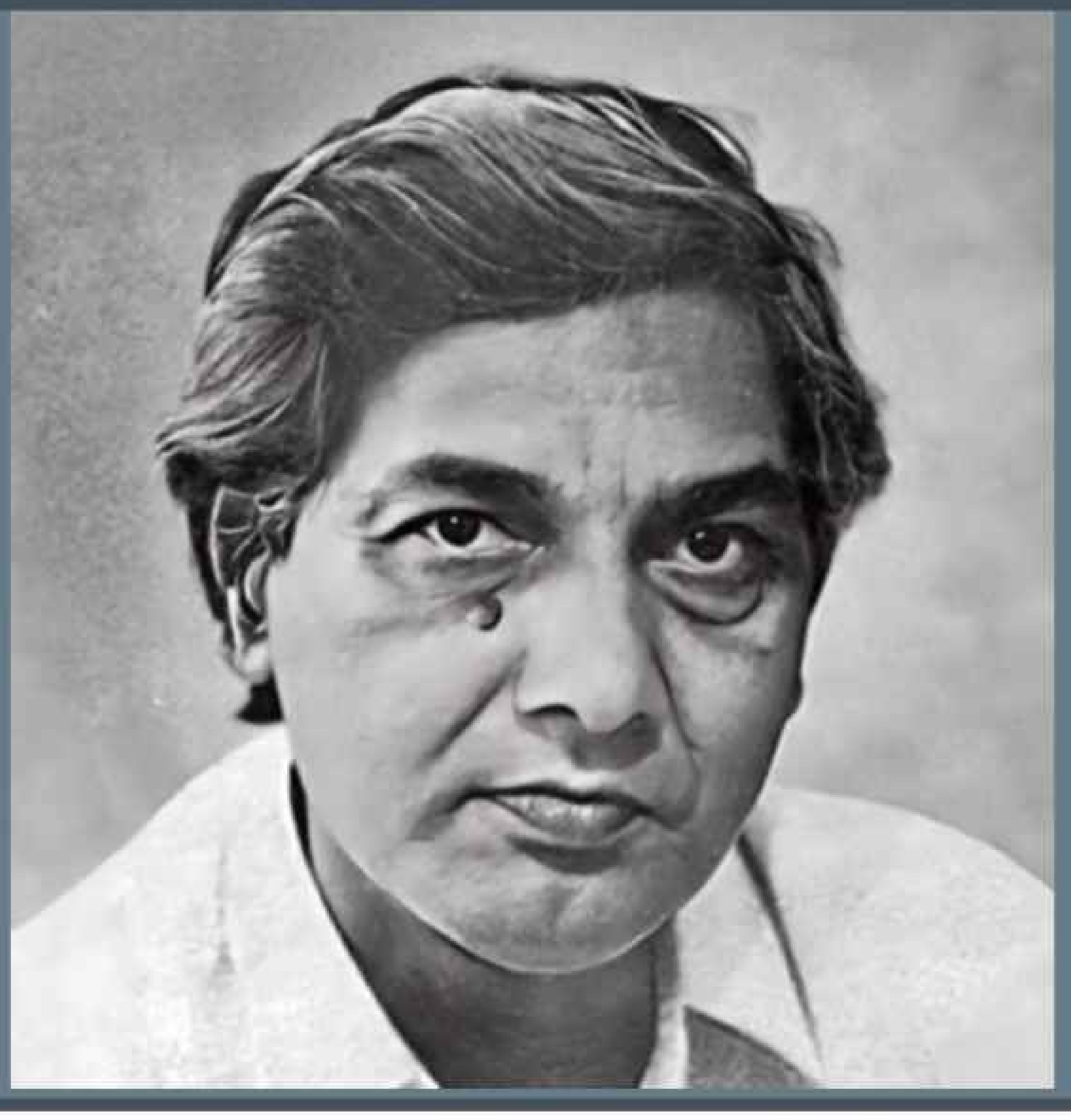

شہریار کی غزل میں آرزو کا عمل

نصرت پروین

شہریار کی شخصیت اور شاعری تعارف کی محتاج نہیں۔ شہریار اردو شاعری کی مشہور و معروف شخصیت کے طور پر مقبول ہوئے۔ ہندوستان کے اعلیٰ ترین انعام ساہتیہ اکیڈمی کے ساتھ گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل کرنے والے اردو کے چوتھے شاعر تھے۔ ان کی شخصیت اوران کی زندگی کے نشیب وفراز میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اس طرح کی روانی قائم کی جس میں زمانے کے سمت ورفتار کی ایک تاریخ پوشیدہ ہے۔

1960 کے درمیان یااس کے بعد جدید شاعری کی تاریخ میں شہریار کوایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ شہریار کی شاعری سحرالبیانی کے ساتھ ساتھ سحر آفرینی بھی ہے۔ یہ قاری کواپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک عجیب سی کیفیت محسوس ہوتی ہے اورقاری سوچنے پر بھی مجبور ہوجاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ شہریار کی شاعری میں احساس وادراک کا بڑا گہرا رول ہے۔ احساس کا مشاہدہ اس قدر مستحکم ہے کہ بعض اوقات دل و دماغ دونوں متحرک ہوتے ہیں۔ شہریار کی شاعری میں آرزوؤں کی نغمگی جابجا نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں میں آرزوؤں کی دنیا اتنی پھیلی ہوئی ہے کہ اس کے بیان میں احساس وادراک کی جوشعائیں پھوٹتی ہیں اس سے اجتماعی زندگی اوروجودی تجربوں کی فضادوردور تک ایک الگ رنگ ظاہر کرتی ہے۔ جس طرح جدید شاعروں میں اگر ہم غور کریں کہ ناصر کاظمی، احمد مشتاق، شہزاداحمد، سلیم احمد، ظفراقبال، منیر نیازی، ساقی فاروقی، شکیب جلالی وغیرہ کئی اور اہم اور بڑے نام ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں رفتگاں کی آوازوں کا جوسراغ پیش کیا، اسی طرح شہریار کے یہاں بھی یہ عناصر ملتے ہیں لیکن شہریار کے یہاں رفتگاں کے سراغ کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے گہرے مشاہدوں میں آرزوؤں کی ایک ایسی دنیا تعمیر کی گئی ہے جوان کوتمام جدید شاعروں سے منفرد کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر ہم غور وفکر کریں تواس سے صاف ظاہر ہوگا کہ شہریار کی شاعری نے شہریار کوآخری دم تک اندر سے پریشان کیا جس کا اظہاران کی نظموں میں جہاں خصوصاً رات کا منظرنامہ بیان کیا گیا ہے، مزید ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں آرزوؤں کا جوعمل ہے، اس میں ماضی سے حال کا رشتہ اس قدر مضبوط ہے۔ ایسے موقع پر شمیم حنفی کا خیال یاد پڑتا ہے:

> ’’ماضی اچھا ہو یا بُرا، اس کا کوئی نہ کوئی جزو حال کی ذات کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ کبھی اس کی قوت بن کراور کبھی ایک متضاد لیکن ناگزیر حقیقت کی شکل میں۔‘‘

(غزل کا نیا منظرنامہ، شمیم حنفی، ص12، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1981)

شہریار کی شاعری کی خصوصیات کو چند سطور میں رقم کرنا ناممکن ہے۔ ان کی شاعری کی داخلی نرمی، نغمگی اورنفاست نے غزلوں میں ایک حسن برقرار رکھا ہے جواس دور کے شاعروں میں بہت کم نظر آئے گا۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کریں:

میں جس کو لکھنے کے ارمان میں جیا اب تک
ورق ورق وہ فسانہ بکھر گیا یارو
ہمراہ کوئی اور نہ آیا تو گلہ کیا
پرچھائیں بھی جب میری مرے ساتھ نہ آئی
جو چند لمحے وقت نے دیے ہیں ان کا کیا کریں
درِ حبیب وا نہیں درِ حیات بند ہے
جہاں پہ تیری کمی بھی نہ ہو سکے محسوس
تلاش ہی رہی آنکھوں کو ایسے منظر کی

ان اشعار میں اسلوب کی خصوصیات جو نظر آتی ہیں، وہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ان شعری تجربات کے احساسات میں زندگی اور کائنات سے وابستگی نے ایک وحدت پیدا کی ہے، جس بنا پر ہم شہریار کی غزلوں کو اپنی زندگی کے مختلف نشیب وفراز میں ساتھ ساتھ ہم نوائی کرتا ہوا محسوس کر سکتے ہیں۔ ان کی آرزوؤں کی دنیا میں صبح کی تازگی کے ساتھ رات کی روشنی بعض اوقات بڑی خوفناک بھی ہو جاتی ہے لیکن پھر دوسری غزلوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو فوراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ ایک تازہ اوس کی مانند بھی ہے جو صبح کی ٹھنڈی ہوا پاکر شاعر کے ماضی سے اس کا پیچھا بھی چھڑا دیتی ہے گویا ایسا محسوس ہوگا کہ گزشتہ رات کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

یہ خصوصیات اس لیے بھی پیدا ہوتی ہیں کہ انسانی جذبات کی نقالی انھوں نے نہیں کی، بلکہ ایک علامت کو نئے سانچے میں برتنے کا ہنر شہریار کو معلوم تھا۔ شہریار فرد، تنہائی، مایوسی، اعصاب زدگی کی داستانیں تو ضرور سناتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری میں ایک حقیقی معنویت اور اس کے حسن کو برقرار بھی رکھتے ہیں۔ جیسا کہ گزشتہ ان کی شاعری میں آرزوؤں کے عمل کو لے کر جو گفتگو ہوئی اس کی نشاندہی ان کے پہلے شعری مجموعے ''اسمِ اعظم'' کی پہلی نظم بعنوان ''خواب''، میں دیکھی جا سکتی ہے۔ نظم ملاحظہ کریں:

نغمگی آرزو کی بکھری ہے
رات شرما رہی ہے اپنے سے
ہونٹ امید کے پھڑکتے ہیں
پاؤں حسرت کے لڑکھڑاتے ہیں
خواب تعبیر کے شکستہ دل
آج پھر جوڑنے کو آئے ہیں

اس نظم میں تقلیدی روش ہی نہیں بلکہ شاعر کے جذبے اور تجربے کی صداقت کا فنکارانہ استعمال ہے۔ اس لیے بھی ان کی شاعری ہر عہد کے انسانی جذبات سے اپنا رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ انھوں نے مرتب سلسلہ خیالات اور مرکزی تصور کو شخصی اور نجی بنایا ہے۔ ان کی آرزوؤں کی دنیا میں بے اطمینانی اور اس کی پیچیدگی، بہت ساری بندشوں اور رشتوں کی تلخی، مشینی زندگی کی تیز رفتاری، آپسی تعلقات کا بکھراؤ، تنہائی اور اس سے گھبرا کر منزلوں سے رخ موڑ لینے کے احساسات وجذبات کا اظہار بھی ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ حقیقی اور بڑا شاعر زندگی اور اس کے مسائل کو محض ایک پہلو سے نہیں دیکھتا۔ ان کے یہاں زندگی اور اس کے مسائل کئی رنگ وآہنگ میں ابھرتے ہیں۔ گہرا مشاہدہ، تجربہ اور ان کے پاس وہ آنکھیں روشن ہوتی ہیں جہاں ہر کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ تبھی تو شہریار نے کیا خوب کہا:

جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے
آگ کے لفظوں سے سارا شہر روشن ہو گیا
ہو مبارک آرزوے خار وخس پوری ہوئی

شہریار کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اتنی ناکامیوں کے باوجود بھی ان کے یہاں کلام میں اعتدال، توازن اور تجسس پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے میں تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ ایک ذہنی اضطراب ضرور قائم ہے لیکن اس میں بھی انھوں نے نئی زندگی کی بشارت کو پیش کیا ہے۔ امیدوں کا طلسم ٹوٹا نہیں ہے۔ زندگی موت کے دروازوں پر کھڑی ہے لیکن نگاہوں میں ایک عجیب سی مسرت بھری امید قائم ہے۔ انھوں نے جس طرح اپنے تجربے کو جذبے میں ڈھال لیا وہ کمال کا فن ہے اور یہ دائرہ ان کی شاعری میں کافی وسیع ہے۔ اس لیے ان کے کلام کو پڑھنے والا ہر شخص ایک نیا منظر نامہ تحریر کر سکتا ہے۔ ان کا لسانی نظام بھی بہت بلند ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی شے میں لذت تلاش کر لیتے ہیں۔ اردو شاعری میں آرزو کا مضمون تقریباً تمام شاعروں نے باندھا ہے لیکن شہریار کے یہاں یہ جدید عصری تقاضوں میں اس طرح باندھے گئے

ہیں جو نئی معنویت سے ہمکنار ہے۔ یہی تو وہ آرزوؤں کی دنیا ہے جو ماضی کے تعلق سے حال کو بہتر بنانے کی تمنا لیے ہوئے ہے۔ یہ بدلتی ہوئی قدروں کا ماتم نہیں کرتے ہیں۔

> **"شہریار کے آرزوؤں کی دنیا میں مشعلِ ہجر، سر پٹکتی ہوائیں، صبح کا دریا، رات کا ظلم، انسانی روح کا کرب، تنہائی، ستم شعار راہیں، اداسیوں کا جھرمٹ، جسمِ ناتواں، اندرونی تشنگی، خوب صورت نرم و نازک یادیں، بدرنگ نڈھال محرم پلکیں، اندھیروں کا دھند، بوجھل ہواؤں کا سناٹا الغرض تمام کیفیات و جذبات کے بیان میں ایک ایسی آرزو کی تکمیل کی خواہش ہے جہاں ان کی روح کو سکون کی تلاش ہے۔"**

شہریار کے آرزوؤں کی دنیا میں مشعلِ ہجر، سر پٹکتی ہوائیں، صبح کا دریا، رات کا ظلم، انسانی روح کا کرب، تنہائی، ستم شعار راہیں، اداسیوں کا جھرمٹ، جسمِ ناتواں، اندرونی تشنگی، خوب صورت نرم و نازک یادیں، بدرنگ نڈھال محرم پلکیں، اندھیروں کا دھند، بوجھل ہواؤں کا سناٹا الغرض تمام کیفیات و جذبات کے بیان میں ایک ایسی آرزو کی تکمیل کی خواہش ہے جہاں ان کی روح کو سکون کی تلاش ہے۔ شاعر اس بسی بسائی دنیا میں عیش و عشرت کی رات گزارنے کا خواہاں بھی ہے۔ شہریار کی شاعری میں دوپہر کا المیہ یہ ہے کہ شاعر کا جسم گویا جس طرح سلگتا ہے وہ رات کے سناٹے میں ایک فرضی دلبر کے تصور سے لپٹ کر اپنا سارا درد و غم بھول جاتا ہے۔ ایک فرضی و خیالی سوچ میں ڈوب کر نیند کے سیلاب میں ڈوبنے لگتا ہے اور خود کو آواز لگاتا ہے۔ تنہائی، تیرگی اور مدھم روشنی میں اس کو ایک عجیب مسرت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جب حقیقت کا پردہ اٹھتا ہے تو شہریار کی آواز گویا اس مصرعے میں گم ہو کر رہ جاتی ہے:

آج بھی روز کی طرح یوں ہی   نیند کے در کو کھٹکھٹائیں گے
لاکھ روئیں گے گڑگڑائیں گے   کاسۂ چشم میں مگر اک خواب
آج کی رات بھی نہ پائیں گے

کاسۂ چشم میں ایک خواب نے جو پناہ لی ہے وہ کبھی نہ ختم ہونے والے سکوت اور سناٹے میں اس شاعر کو پھڑ پھڑاتا ہوا چھوڑ جاتی ہے۔ یہ عمل ان کی شاعری میں مسلسل رواں ہے۔ انھوں نے جس تکنیک کا سہارا لے کر اپنے شغف کا اظہار کیا اس میں ایک ایسی سچائی ظاہر ہوتی ہے جو شہریار کے خیال میں جیتی جاگتی ایک دنیا سے ہمیں روبرو کراتی ہے۔ ہم ان کے اظہار کو سچا اور جیتا جاگتا انسانی کرب کا واحد ذریعہ بھی مان لیتے ہیں۔ آرزو کی شکست و تنہائی کا بے پناہ احساس ہمیں کسی اور شاعر کے یہاں اس درجے کا نہیں ملتا۔

خوابوں اور یادوں کا جو سلسلہ انھوں نے قائم کیا وہ آخر دم تک ان کی شاعری میں موجود رہا۔ انسان کے حالات جیسے بھی ہوں خواب اور امید کہیں نہ کہیں اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ لیکن شہریار کے یہاں ایک انجانے خوف کا منظر بھی نظر آتا ہے۔ اگر ان کی شاعری میں ہم بصری استعاروں کو دیکھیں تو ستارے، سمندر، کشتی، مکان، پرندے، گھر، خار و خس، رات، درخت، روشنی وغیرہ نے جذبے کی شدت کے بیان میں ایک جیتی جاگتی مگر کہیں خوفناک یا ڈراؤنی تصویر بھی بنائی ہے۔ ریت کا سلسلہ اور یہ وہم ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یقیناً شاعری کے مشاہداتی پہلو کو تو انھوں نے ضرور اجاگر کیا، لیکن اشعار میں عصری مسائل کا ردعمل شہریار کے جذباتی کیفیات کو ایک الگ معنی میں بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کریں:

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے
چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دنیا کی

منتشر کر چکی آندھی تو یہ معلوم ہوا
اک بگولے کی طرح ریت کے گھر میں ہم تھے

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو
میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

یہ نئے طرز احساس کی شدت، تجربات کی پہلوداری، جدید انسان کی صورت حال، المناک کیفیات کا تخلیقی بیان انسان کی ذات

کا حصہ نہیں بن جاتا۔ ان کی غزل اس عہد اور انسانی روح کو اپنی گرفت میں رکھنے پر بڑی قادر ہے۔ جو عذاب شاعر پر مسلط ہے وہ انسانی فکر و احساس کی وادیوں کا ہی چکر لگاتا ہوا اس کی روداد سناتا ہے۔ اس لیے بھی شہریار کی غزلیں ایک ایسی وحشت کو بیان کرتی ہیں جس میں اجڑے مکان، آنسوؤں کی ندیاں، شخص کی رسوائی نے اپنی انفرادیت ظاہر کی ہے۔ مگر ان تمام چیزوں کا تعلق ان کے یہاں رومانیت سے ذرا بھی نہیں ہے۔ آرزو اور اس کے عمل پر انھوں نے ایک دو اشعار ہی نہیں لکھے بلکہ مکمل غزلیں بھی کہی ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک ایسے ماحول کے آرزومند ہوئے ہیں جس میں بدحال اور بے چین انسانوں پر سازشیں ہوتی ہیں۔ شہریار آرزو کے حوالے سے بہت سی باتوں کا خلاصہ بھی کرتے ہیں۔ آرزو سے متعلق گزشتہ ذکر بھی بار بار آیا ہے لہٰذا یہاں ان کی آرزوؤں کی دنیا میں امن وسکون اور ایک پرامن ماحول کی کھلی فضا اگر قائم نہیں ہو پاتی تو یہ تصور میں ہی اس فضا کو قائم کرنے کی سوچتے ہیں اور اس خیال میں جو اشعار انھوں نے رقم کیے ہیں وہ بھی دیکھیے:

گھر کی تعمیر حقیقت میں نہیں ہو سکتی
تو چلو اس کو تصور ہی میں تعمیر کریں
جس کی تعمیر تصور میں بھی ناممکن ہے
دل نے نقشہ ہی بنا رکھا ہے گھر کا ایسا

یہ عناصر ہمیں ان کی نظموں اور غزلوں میں بیک وقت مل جاتے ہیں۔ غزل میں اس عنوان سے انھوں نے ''میرے حصے کی زمیں'' الگ ایک قسط شائع کرائی۔ شہریار نے یہ کوشش برابر کی ہے کہ خود کو پرعزم طریقے سے یا ان احساسات کو مثبت پہلو سے ہی اجاگر کیا جائے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس لیے یاس و حرماں اور قنوطیت والی شخصیت یا اس الجھاؤ کو جہاں بھی پیش کیا گیا ہے وہاں شاعر کا حوصلہ، ہمت اور استحکام ظاہر کرتا ہے۔ شاعر کو شبِ غم کی تلاش میں ہی ڈوبتا ہوا انھوں نے ظاہر نہیں کیا، بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر ہمت و حوصلے کو انھوں نے قائم رکھا ہے۔ کچھ شعر دیکھیں:

آنکھیں خلا کی دھند سے آگے کریں سفر
اک نور کی لکیر افق پر نظر تو آئے
عمر بھر باقی سفر کرنا ہے اس شرط کے ساتھ
دھوپ دیکھیں تو اسے سائے سے تعبیر کریں

ان اشعار میں نازک احساسات و جذبات کے کتنے گہرے مشاہدے پیش کیے گئے ہیں جو شاعر کو اتنی گہری خلا کی دھند سے آگے کی منزل کے لیے تیار کرتے ہیں۔ شہریار نے زندگی کی ناہمواریوں میں بھی خلوص اور دردمندی کے ساتھ اپنے تخلیقی عمل میں ایک امید کی کرن جلائے رکھی۔ غزل کے منظرنامے میں شہریار کی موجودگی نہ صرف جدید انسان اور اس کے جذبات کا جواز فراہم کرتی ہے بلکہ زندگی کی معنویت کو برقرار رکھنے کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ اس لیے شہریار فرماتے ہیں:

زخموں کو رفو کر لیں دل شاد کریں پھر سے
خوابوں کی کوئی دنیا آباد کریں پھر سے

شہریار کے اظہار کی ترسیلی قوت بہت مستحکم ہے۔

شہریار کی شاعری میں سب سے اہم موضوع خواب ہے۔ ان کی جو خواہش تھی اس کو انھوں نے خواب کی شکل دے دی ہے۔ ''خواب کا در بند ہے'' میں بھی ان کی آرزوؤں کی دنیا کا جو تصور ہے اس میں خواب کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ اس خواب کی دنیا میں ان کی حقیقی دنیا بھی شامل ہے اور اسی لیے شہریار اپنے خوابوں کو ہر حال میں زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہاں رات اسی لیے تاریکی کے مقابلے میں روشنی کا استعارہ ہے۔ یہ رات اتنی ہولناکی کے باوجود بھی شاعر کے لیے خیر مقدمی ہے۔ اگر ہم ان کے کلام پر غور وفکر کریں تو یہ واضح ہوگا کہ دراصل یہ تمنائیں، یہ آرزوئیں انسان کے خواب کی ہی ایک شکل ہیں، جس کو شہریار نے خواہشوں کی لڑیوں میں پرو دیا ہے۔

□□□

Dr.Nusrat Perween
B-154, Abul Fazal Enclave,
Jami Nagar, New Delhi-110025
Mobile: 9015133636
Emai: nusrat.rizwan07@gmail.com

ترنم ریاض کی شاعری کے مختلف پہلو

نگہت

وسطی کشمیر کی شاعرات میں روپہ بھوانی، پران کشوری، سوشیلا تکو، شہزادی کلثوم، عائشہ مستور، سلمیٰ فردوس، عابدہ احمد، نصرت رشید، کسم دھر شاردا، صاحبہ شہریار، رخسانہ جبیں، پروین راجہ، نصرت آرا چودھری، فریدہ کول، نسرین نقاشی، درخشاں اندراوی، نگہت فاروق اور ترنم ریاض ہیں۔ان شاعرات میں ترنم ریاض کا نام بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے خود کو کسی مخصوص صنف کے دائرے میں قید کر کے نہیں لکھا بلکہ مختلف اصناف پر لکھا ہے۔ان کی زبان دانی کا اعتراف گوپی چند نارنگ، ابوالکلام قاسمی، وہاب اشرفی، نیّر مسعود، عتیق اللہ، سید محمد اشرف، صغیر افراہیم، طارق چھتاری اور حقانی القاسمی نے بھی کیا ہے۔

ترنم ریاض کا شمار نثر نگار ہونے کے ساتھ اچھی شاعرات میں بھی ہوتا ہے۔انھوں نے غزل سے لے کر آزاد نظم، پابند نظم، نثری نظم اور ماہیے لکھ کر اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا ہے۔ان کے افسانوں، ناولوں اور شاعری میں خواتین کے احساسات و جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔اس معاشرے میں انھیں جدید عورت کے مسائل کے تخلیقی بیان کے لیے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ انھیں بیک وقت اردو، ہندی، عربی، فارسی، کشمیری اور انگریزی زبانوں پر دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی میں مختلف ممالک کا سفر کیا۔ان کی شعری تخلیقات کشمیر سے نکلنے والے رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ جن رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوئیں ان کی فہرست اس طرح ہے، شعر و حکمت حیدر آباد، شاعر ممبئی، نیا دور اتر پردیش، شیرازہ کلچر اکیڈمی سری نگر، جہات سری نگر، آجکل، ایوان اردو، مباحثہ بہار، انشا کلکتہ، صدا لندن، تخلیق لاہور وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ترنم ریاض اپنے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان کی شاعری کا آغاز چھٹی جماعت کے ریاضی کے پرچے میں ناکامی کے بعد ہوا۔ انھوں نے پہلی بار شعر کہا تو ان کے والد نے انھیں خوب سراہا۔ حالانکہ کشمیر میں ان دنوں لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے کا رواج کم ہی تھا۔گھر کا ماحول ادبی ہونے کی وجہ سے ان کے اندر کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔

ترنم ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز 1975 میں بارہ سال کی عمر میں ہوا۔ ان کے شعری مجموعے ’پرانی کتابوں کی خوشبو‘(2005)، ’بھادوں کے چاند تلے‘(2015)، ’زیر سبزہ محو خواب‘(2015) کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔انھوں نے تینوں مجموعوں کی ابتدا حمد، نعت اور منقبت کے اشعار سے کی ہے۔انھوں نے اردو شاعری کی آبیاری منفرد انداز میں کی۔ ان کا شعری مجموعہ ’پرانی کتابوں کی خوشبو‘ کے عنوان سے منظر عام پر آیا تو اردو کے متعدد ناقدین نے اسے خوب سراہا۔ پروفیسر عتیق اللہ ترنم ریاض کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’ترنم ریاض کی شاعری کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ دور کی خواتین شاعراؤں میں ترنم واحد شاعرہ ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں کی طرح ہی زندگی کے مختلف مسائل کی عکاسی نہایت ہی نازک بیانی سے کی ہے۔‘‘ (ماہنامہ، شیرازہ، سری نگر کشمیر، جلد نمبر 59، ص 20)

نظم ’یا سمیع الدعا‘ خواتین کی بے بسی اور محرومی کی بہترین ترجمان ہیں۔ جس میں وہ خدا کی ذات سے فریاد کرتی نظر آتی ہیں۔ اس نظم میں عورت ذات مسلسل درد و کرب سے گزرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ مجموعہ ’پرانی کتابوں کی خوشبو‘ سے حمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

’’خالق دو جہاں / میں ہوں واحد وہ تخلیق تیری / جہاں کے
بہشت بریں پر / جو مخلوق اشرف کے پھلنے کا موجب بنی / یا
علیم السمیع / جس کی پسلی سے کی تھی مری ساخت / اس کی
رفاقت کی خاطر / وہ تنہاں نہ ہو‘‘

ترنم ریاض نے اپنے کلام میں ابہام اور علامتوں سے ممکن حد تک گریز کیا ہے۔ ان کی غزلوں، نظموں اور ماہیوں میں خواتین کے احساسات و جذبات اور کشمیر کے حالات صاف نظر آتے ہیں۔ خواتین کے جذبات کو سمجھنے کے لیے نظم ’مجبوری‘ ایسی ہی ایک نظم ہے جس میں عورتوں کے جذبات کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اک اک سانس کی خاطر / دل کو سمجھانا پڑتا ہے / میرے
ہی حصہ کی خوشیاں / رستہ بھٹکیں / کون سے دیس گئیں /
اب کس میں ہمت ہے / جو ان کو ڈھونڈ کر لائے / میں تو
تھک کر چور ہوئی

ترنم ریاض نے اس نظم میں اپنی خوشیوں کے روٹھ جانے کی بات کی ہے اور گزارش کی ہے کہ کوئی شخص ان خوشیوں کو ڈھونڈ کر لائے۔ یہ خوشیاں کہاں چلی گئی ہیں۔ انھیں تلاش کرتے کرتے وہ تھک چکی ہیں۔ ان کی شاعری اضطرابِ زندگی کی شاعری ہے۔ وہ حسن و عشق، گل و بلبل یا رقص و سرور کی بات نہیں کرتیں بلکہ اضطراب اور آفاقی قدرت کی بات کرتی ہیں۔ جدید فکر و فلسفے کے باعث ہماری

ترنم ریاض کی نظموں میں کیف و نشاط، التجا اور درد کے ساتھ چبھن بھی ہے۔ ان کے کلام میں وفادار، خوددار اور باکردار عورت کا تصور بھی صاف نظر آتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں تعلیم یافتہ عورت اور موجودہ معاشرے کے مردوں کی نفسیات کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ رشتوں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں

معاشرتی زندگی میں جو انتشار و اختلال پیدا ہوا ہے، اس کا انھیں شدید احساس ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں بھی مایوس کن حالات و واقعات کی ترجمانی دیکھنے کو ملتی ہے۔ غزل کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

غلط جو بھی ہو اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہے
کہ ہر اک کارنامہ ان سے ہی منسوب ہوتا ہے
غلط کلام سے نس نس میں زہر گھولتا ہے
وہ خاک میں مرے موتی سے اشک رولتا ہے

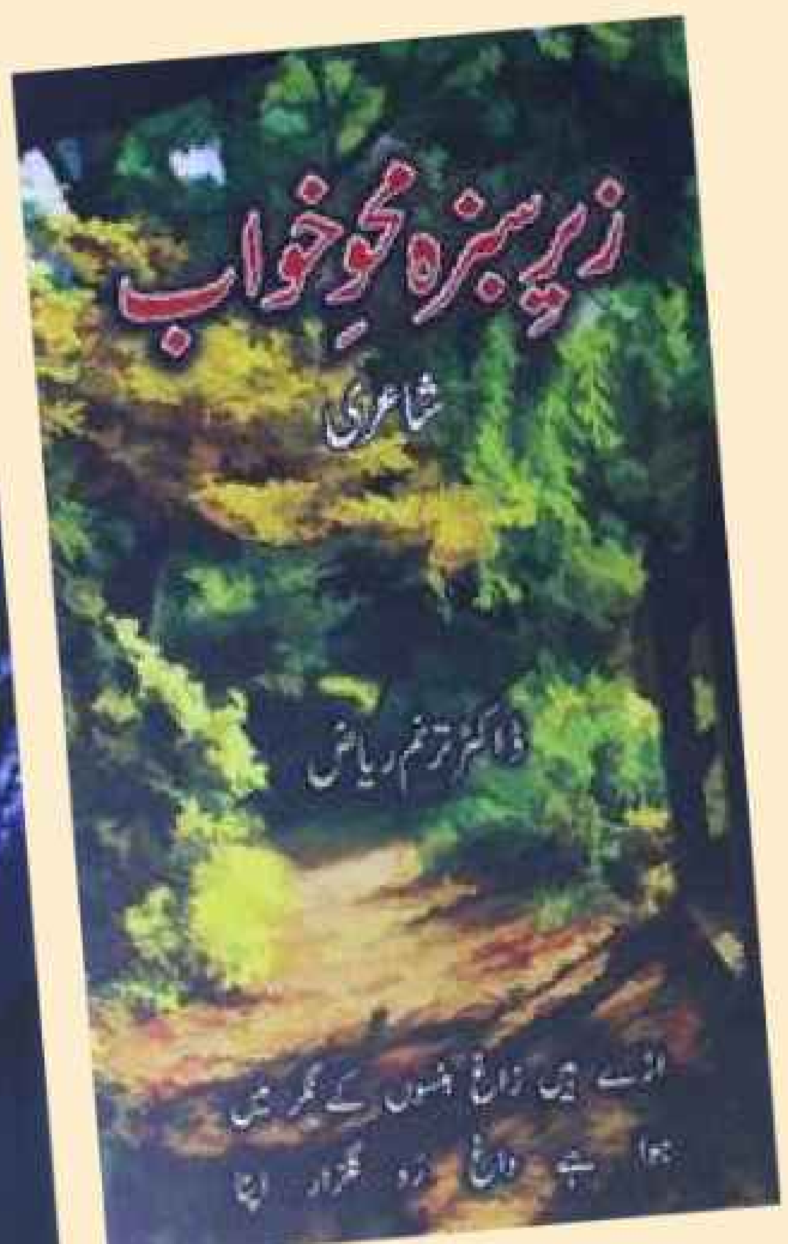

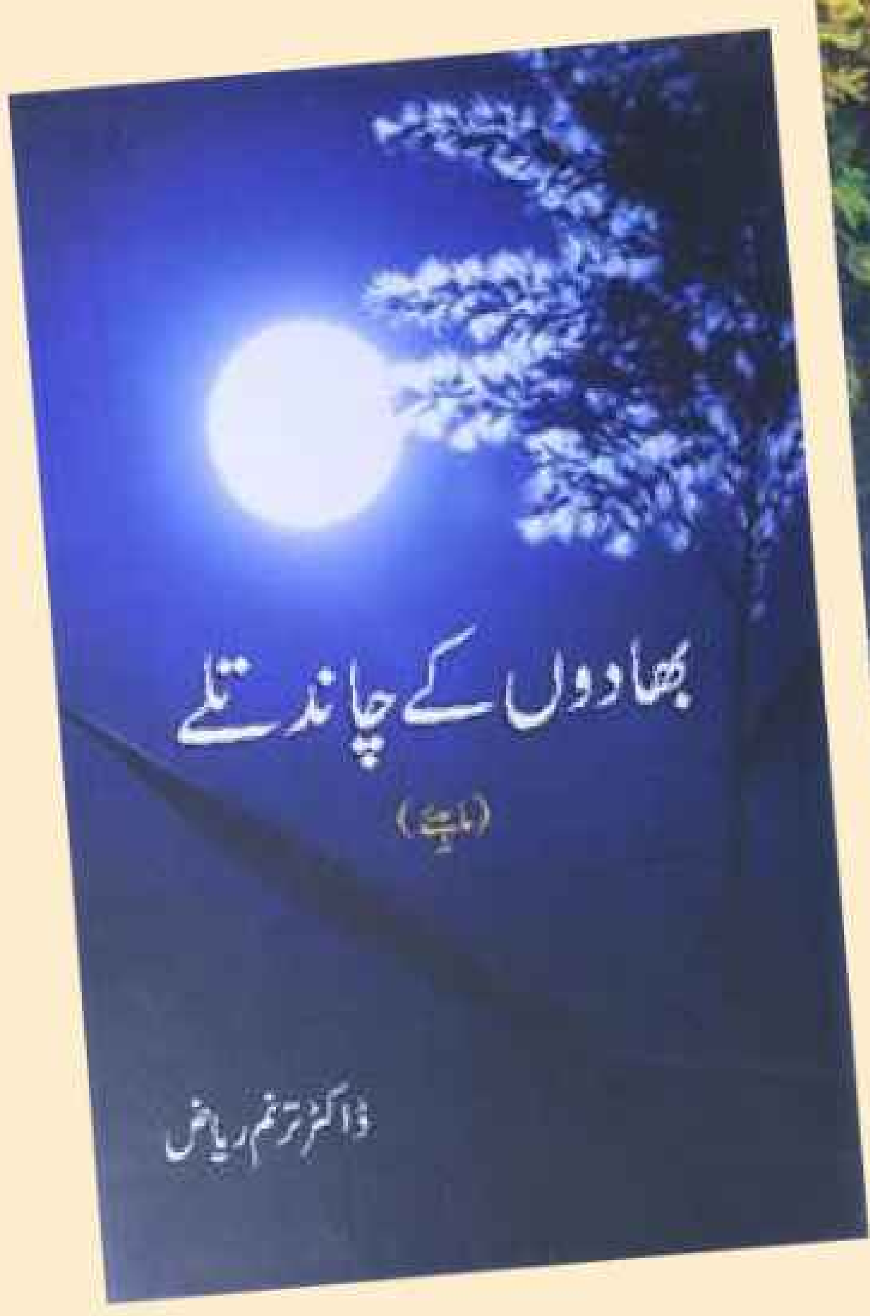

ترنم ریاض کے کلام میں بچپن، جوانی، شادی، بچے، شوہر کی محبت، مرد کی بے وفائی اور کشمیر کی خوبصورتی سے لے کر بدحالی تک کا ذکر ہے۔ وہ اپنی بیشتر تخلیقات میں کشمیر کی خوبصورتی، یہاں کی خوشگوار فضا، جھیلوں، چشموں اور پرندوں کا ذکر بڑے ہی پرلطف انداز میں کرتی ہیں۔ حالانکہ ان کے انداز بیان میں ہلکی سی افسردگی بھی ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ خدا کی بنائی ہوئی کائنات اور اس میں رہنے والی مخلوقات سے محبت کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں احساسات و جذبات کی نازک مزاجی کا عنصر قاری کو سحر انگیزی میں لے جاتا ہے۔

ترنم ریاض کی نظموں میں کیف و نشاط، التجا اور درد کے ساتھ چبھن بھی ہے۔ ان کے کلام میں وفادار، خوددار اور باکردار عورت کا تصور بھی صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تعلیم یافتہ عورت اور موجودہ معاشرے کے مردوں کی نفسیات کو بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ رشتوں کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے رشتوں کی اہمیت پر کئی غزلیں اور نظمیں لکھیں۔ ان میں خواتین کے دکھ، درد، جذبات واحساسات اور ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا بیان ملتا ہے۔ ان کے کلام میں خوداعتمادی اور خودشناسی کا اظہار بھی بخوبی نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کی طرح نظموں اور غزلوں میں ماں کی عظمت اور قربانی کو موضوع بنایا ہے۔ اس حوالے سے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جنم جس کو دیا اتنے ارمان سے — خود کو ٹکڑے کیا، بوجھ کر جان کے
مجھ کو ان رت جگوں کا ملے کچھ صلہ — ٹوٹ جائے نہ الفت کا یہ سلسلہ

ترنم ریاض کی نظموں میں مشرقی عورت کی فکر، رشتوں کی پامالی، سکون قلب کی تلاش، شب کی سیاہی میں بے خوابی کا منظر اور ذات کی گمنامی میں موجودہ مسائل بھی ہیں۔ ان کی نظمیں خواتین کی آواز ہیں جن میں زندگی کا ہر پہلو سمایا ہوا ہے۔ اسی لیے ان کے کلام کو پڑھتے ہوئے حقیقت کا سا گمان ہوتا ہے۔ وہ شاعری میں علامہ اقبال سے متاثر نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی کئی غزلیں کی زمین میں لکھی ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم 'ایک آرزو' میں پہاڑ کے دامن میں زندگی گزارنے کی آرزو کی ہے۔ اسی طرح ترنم ریاض نے

> ترنم ریاض کی تحریروں میں ہی نہیں بلکہ ان کی ہر سانس اور خون کے ہر قطرے میں کشمیر رچا بسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں، نظموں کے ساتھ ماہیوں میں بھی کشمیر کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں کشمیر کے سنہرے دور سے لے کر موجودہ عہد کا کشمیر بھی نظر آتا ہے۔

نظم 'وصیت' میں پہاڑ کے دامن میں مرنے کی وصیت کی ہے۔ ان کے یہاں موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں خواتین کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی نظموں میں تانیثی شعور کے ساتھ خواتین کے مسائل اور وطن سے محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد نظموں کے مقابلے بہت کم ہے لیکن ان کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ کے ساتھ ساتھ جدید شعری رنگ بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے دور حاضر کے مسائل کی عکاسی کے ساتھ خواتین کے حقوق و مسائل کی ترجمانی بھی کی ہے۔ غزل کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

شجر کو دیتی ہوں پانی وہ آگ اُگلتا ہے
میں فصل خار کی چننے کو پھول بوتی ہوں
یہ کس نے بوئی ہیں چنگاریاں تیری زمینوں میں
یہ کس نے آگ سی سلگائی ہے معصوم سینوں میں

احتجاج کی روایت قدیم کلاسیکی شعرا جعفر زٹلی، ولی، میر اور سودا سے ملتی ہے۔ انھوں نے اس زمانے میں ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف احتجاجی شاعری کی۔ آج بھی شعرا مختلف طریقے سے عہد حاضر کے مسائل کو اپنی نظموں، غزلوں اور دوسری اصناف میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ترنم ریاض نے نثر کے ساتھ اپنی شاعری میں بھی کشمیر کے حسن و جمال کے ساتھ وہاں کی تباہ حالی کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کی بیشتر

تخلیقات میں کشمیر کی تہذیب وتمدن، مذہب وسیاست، کانگڑی، کشمیری شال، میوے، فیرن اور زعفران وغیرہ کا ذکر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

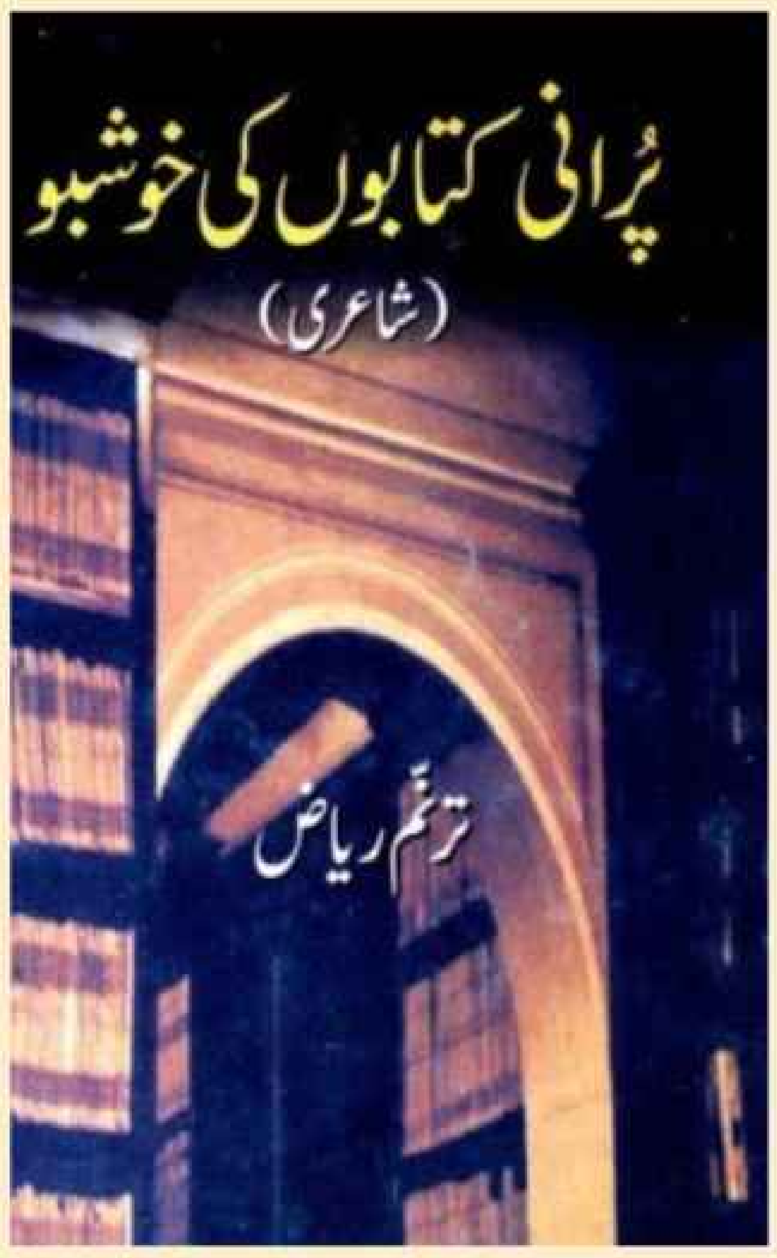

ترنم ریاض کی تحریروں میں ہی نہیں بلکہ ان کی ہر سانس اور خون کے ہر قطرے میں کشمیر رچا بسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں، نظموں کے ساتھ ماہیوں میں بھی کشمیر کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں کشمیر کے سنہرے دور سے لے کر موجودہ عہد کا کشمیر بھی نظر آتا ہے۔ ماہیا پنجابی لوک گیت کی ایک ایسی قسم ہے جسے پنجاب کی شادی بیاہ اور تیوہاروں کے موقعے پر گایا جاتا ہے۔ ان کا تعلق سری نگر کشمیر سے تھا، وہ بچپن سے ہی اپنے آس پاس کے ماحول میں ماہیے سنتی رہی تھیں۔ انھوں نے اس صنف میں اپنے جذبات و احساسات کا بڑی خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔

ترنم ریاض کا ماہیوں کا مجموعہ 'بھادوں کے چاند تلے' ہے۔ اس میں آٹھ مختلف عنوانات پر ماہیے لکھے ہیں جن میں ان کا لب ولہجہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ان ماہیوں میں خدا سے عقیدت، زمانے کا غم، سکون کی تلاش اور کشمیر کے لوگوں پر ہو رہا ظلم وستم بھی نظر آتا ہے۔

عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی شاعری میں اس کا اظہار کھل کر کیا گیا ہے۔ ترنم ریاض نے بھی ماہیوں کو عشق کے حسین پیکر میں ڈھالا ہے بلکہ اس صنف کو مزید عشق کے رنگوں سے بھر دیا ہے۔ کشمیر میں ماہیا نگار کی حیثیت سے ترنم ریاض اور نسرین نقاش کا نام قابل ذکر ہے۔ ترنم ریاض نے غزل اور نظم کی طرح صنف ماہیا میں بھی مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ترنم ریاض کے یہ ماہیے ملاحظہ ہوں۔

ہر مشکل حل ہو جائے / وادی مری پہ خدا / برا وقت کبھی
بھی نہ آئے / جب چاند نکل آئے / دل کی تڑپ مجھ کو / تیرا
رستہ دکھلائے / مشکل پہ مشکل ہے / ستم زمانے کے / اور
تنہا اک دل ہے

ترنم ریاض کے یہاں کشمیری اور پنجابی دونوں زبانوں کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری اور افسانوں میں سرزمین کشمیر کی عکاسی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ ان کی تخلیقات فنی اصولوں پر پوری اترتی ہیں۔ انھوں نے عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات و حادثات کے علاوہ آپسی بھائی چارے کو بھی اپنے فن پاروں میں پیش کیا ہے۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے لوگوں کے درمیان کی دوری کو مٹانا چاہتی تھیں۔ ان کے نزدیک دونوں ممالک کی تہذیب وتمدن ایک ہیں تو پھر یہ جھگڑا کس بات کا ہے۔ ان کی تخلیقات کا سب سے اہم موضوع تانیثیت ہے۔ اس موضوع کو انھوں نے افسانوں، ناولوں اور اپنی شاعری میں بھی برتا ہے۔

ترنم ریاض اپنی بات کو منفرد انداز سے قاری تک پہنچانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں، ان کی نظموں میں منظر نگاری، جذبات نگاری اور واقعات نگاری کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترنم ریاض نے ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی۔ ان کی شاعری کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو کشمیر سے ان کی والہانہ محبت، وہاں کے ذرے سے آفتاب تک کا بیان ان کی تخلیقات میں بخوبی ملتا ہے۔

□□□

Nighat
Dept of Urdu, Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 9368089916
nighatkhanurdu@gmail.com

رہنما بانو

ساجد رشید کے افسانوں میں سماجی و سیاسی شعور

1980 کے بعد نئے افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام ساجد رشید کا ہے۔ مابعد جدید افسانے کا جو دور اس وقت شروع ہوا ان میں ساجد رشید کے معاصرین میں شموئل احمد، علی امام نقوی، حسین الحق، سید محمد اشرف اور سلام بن رزاق وغیرہ اردو فکشن میں فکر و فن کے حوالے سے اہم شخصیات ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے معاصر عہد کو اپنے فکشن کا موضوع بنایا۔ ساجد رشید کے افسانوی مجموعوں کے مطالعہ میں جو چیز بہت واضح انداز میں نظر آتی ہے وہ ان کا کہانی پن ہے۔

انھوں نے کبھی کسی تحریک یا فرقہ سے خود کو نہیں جوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کسی تحریک کی صدائے بازگشت نہیں ہیں۔ ان میں وہی مسائل مرکز توجہ بنے ہیں جن سے جدید عہد میں فرد اور انسانیت نبرد آزما ہے۔ ان کے اداریوں کے ذریعے ان کے فکری و فنی شعور پر بخوب روشنی پڑتی ہے۔

سلام بن رزاق، ساجد رشید اور علی امام نقوی نے اپنی کہانیوں کے ذریعے اردو ادب میں ہندوستان کے اہم شہر ممبئی کی سماجی و معاشرتی تصویر کو محفوظ کیا ہے۔ ساجد رشید کے چار افسانوی مجموعے ہیں۔ 1980 میں ایمرجنسی کے بعد پہلا افسانوی مجموعہ 'ریت گھڑی'، دوسرا مجموعہ 1990 میں مہاراشٹر سے 'نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی' شائع ہوا جس میں کل 11 افسانے شامل ہیں۔ 2004 میں تیسرا مجموعہ 'ایک چھوٹا سا جہنم' دہلی سے شائع ہوا۔ آخری مجموعہ 'مردہ سر کی کہانی' 2011 میں ممبئی سے شایع ہوا جس میں کل اٹھارہ افسانے اور ایک نا مکمل ناول 'جسم بدر' شامل ہے۔

انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں ممبئی کی معاشرتی تصویر کھینچی ہے جہاں رخش زندگی کی رفتار بہت تیز ہے، جہاں مصروفیتوں نے یگانگت کے احساس کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، جہاں معاشرتی رشتے صرف علیک سلیک تک ہی ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ 'اوپر سے گرتا اندھیرا' اسی موضوع پر مبنی ہے، جہاں واحد متکلم کے بچی کی لاش فرش پر پڑی ہے۔ اس کی ماں بین کیے جا رہی ہے۔ اس کی بیوی جو نئے تہذیبی اطوار سے واقف ہے صرف سسک رہی ہے۔ اور وہ خود بھی غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے انتظار ہے کہ اس غم میں اس کے ساتھی اور احباب آ کر اسے دلاسہ دیں گے۔ لیکن اسی انتظار میں شام ہو جاتی ہے اور تعزیت میں اس کے احباب کالے ملبوسات میں آتے ہیں اور پرسہ دے کر واپس چلے جاتے ہیں۔

ایک کہانی میں انھوں نے جنازے کے ساتھ قیمتی اشیا کو بھی

رکھنے کی تلقین کی ہے۔ اس میں سونے، چاندی اور دیگر زیورات شامل ہیں۔اس کہانی میں فلیٹ میں موجود اشیا کی جزئیات کو بار بار ساجد نے اس لیے پیش کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ان سجے سجائے گھروں میں زندگی اس ’یگانگت اور انسیت‘ سے محروم ہے جس سے زندگی سجتی ہے۔انسانی رشتوں کی تمازت جس سے زندگی میں حرکت و حرارت پیدا ہواتی ہے یہاں مفقود ہے۔’’اوپر سے گرتا اندھیرا‘‘ جس نے انسانی ہمدردی کو نگل لیا ہے، جس نے پرانی تہذیب کی روشنی کو گل کر دیا ہے اور جدید دور کی زندگی کی ایک تصویر پیش کرتا ہے۔ جہاں نئی تہذیب کے پروردہ میت کے لواحقین کی مدد کرنے کے بجائے professional طریقے سے تعزیت کرتے ہیں اور الٹے پاؤں مصروفیت کا بہانہ کر کے لوٹ جاتے ہیں۔وجودی ناول نگار البرٹ کامیو کے ناول The Stranger جس کا اردو ترجمہ اجنبی (مترجم۔ڈاکٹر افضل اقبال) اور بیگانہ (مترجم۔عبدالحی) کے نام سے کیا گیا ہے کا مرکزی کردار ’موسیو مرسو‘ اپنی ماں کے انتقال پر دوسروں کو بین کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اسے ان کی منافقت سے تعبیر کرتا ہے۔اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی ماں کی موت سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔پھر بھی لوگ اظہار غم کر رہے ہیں۔اسے ان سب سے نفرت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ جنگ عظیم کے بعد کے اس انسان کی نمائندگی کرتا ہے جس کا انسانی تہذیب و تمدن پر سے ایمان اٹھ گیا ہے۔لیکن جدید عہد میں تو کوئی رونے والا اور دلاسہ دلانے والا بھی نہیں ہے، جس کا اظہار اس کہانی کے مرکزی کردار کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

ٹوٹتے بکھرتے رشتوں پر افسانہ ’’ایکسرے‘‘ (ریت گھڑی) بھی مبنی ہے۔جس میں ایک شخص accident کے بعد ہسپتال پہنچ جاتا ہے۔پوری کہانی اس کے دوست کے سوچ اور نقطہ نظر سے ہم تک پہنچی ہے۔یہ کہانی دراصل اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے کہ کسی کی موت سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا سوائے اس کے اعزہ کے۔باقی سارے رشتے ناتے صرف ایک دکھاوا ہیں جو تہذیب اور سماج کے نام پر دکھاوے کے لیے موت کے اس غمناک موقعہ پر اپنی آنکھوں کو نم اور چہرہ پر مایوسی کا غلاف اوڑھ لیتے ہیں۔یہ کہانی بھی واحد متکلم کے صیغہ میں بیان کی گئی ہے جس کے ذریعہ اس کے دوست کے اقربا، اسپتال کے چپراسی سب کی منافقت کو پیش کیا گیا ہے۔کہیں کہیں طنزیہ انداز بھی ساجد نے اختیار کیا ہے۔

یہاں پر ساجد رشید کا صحافتی انداز ظاہر ہوا ہے جس کی وجہ سے جملہ میں سپاٹ پن پیدا ہو گیا ہے۔

البرٹ کامیو کے ناول کے کردار اور اس افسانہ کے کردار میں فرق ہے کہ کامیو کا کردار دوسرے کی منافقانہ روش کو حقیر سمجھتا ہے اور خود کو معتبر لیکن ساجد رشید کا یہ کردار جس کا باطن خود بھی اسی منافقانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے جدید عہد میں سماجی رشتہ کے کھوکھلے پن کو ظاہر کرتا ہے۔

انتظار حسین نے ایک افسانہ لکھا ہے ’زرد کتا‘ جس میں نفس امارہ کی علامت کے طور پر زرد کتا پیش کیا گیا ہے۔نفس امارہ جو برائی کی ترغیب دیتا ہے۔خواہشات کو جلا دیتا۔اس کہانی میں بھی کتے کا حقیقی

وجود نہیں ہے بلکہ وہ اپنی کی جنسی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

> ساجد رشید نے اپنے افسانوں میں ممبئی کی کمرشیل زندگی کی بھی تصویر پیش کی ہے۔افسانہ ’جنت میں محل‘ (مجموعہ۔ ایک چھوٹا سا جھنم) کا پہلا اقتباس ایسا ہے جو قاری کی توجہ کھینچتا ہے۔یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس کا تعلق مسلم متوسط طبقے سے ہے۔دور جدید میں روزگار کے مسائل بڑھتے جا رئے ہیں۔ممبئی ایسا شہر جہاں انسان اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے جاتا ہے۔ دیش کی بیشتر آبادی دلی، ممبئی جیسے شہروں کا رخ حصول روزگار کے سلسلے میں کرتے ہیں۔ کچھ تو وہاں جا کر جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ سادہ لوح نوجوان دولت کے حصول کے لیے بآسانی پیشہ ور قاتل بن جاتے ہیں۔

ساجد رشید نے اپنے افسانوں میں ممبئ کی کمرشیل زندگی کی بھی تصویر پیش کی ہے۔افسانہ ’جنت میں محل‘ (مجموعہ۔ایک چھوٹا سا جہنم) کا پہلا اقتباس ایسا ہے جو قاری کی توجہ کھینچتا ہے۔یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جس کا تعلق مسلم متوسط طبقے سے ہے۔دور جدید میں روزگار کے مسائل بڑھتے جارئے ہیں۔ممبئ ایسا شہر جہاں انسان اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے جاتا ہے۔ دیش کی بیشتر آبادی دلی، ممبئ جیسے شہروں کا رخ حصول روزگار کے سلسلے میں کرتے ہیں۔کچھ تو وہاں جا کر جرائم پیشہ سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔سادہ لوح نوجوان دولت کے حصول کے لیے بآسانی پیشہ ور قاتل بن جاتے ہیں۔علی امام نقوی نے ’تین بتی کے راما‘ ناول میں انھیں راماؤں کی کہانی درج کی ہے جو معاش کی تلاش میں ممبئ آتے ہیں اور یہاں کی زندگی میں ایسے پھنس جاتے ہیں کہ پھر کبھی اپنے گاؤں کا رخ نہیں کر پاتے۔سلام بن رزاق نے بھی اس موضوع پر افسانہ ’روزگار‘ لکھا ہے، جس میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو معاش کی تلاش میں ممبئ آتا ہے لیکن اسے ایک ایسی ملازمت ملتی ہے کہ اسے play boy بنا پڑتا ہے۔ان کا یہ افسانہ نئے عہد کے ایک اہم مسئلے کو سامنے لاتا ہے جہاں مرد بھی طوائف ہے۔ساجد رشید کے افسانے ’جنت میں محل‘ کا مرکزی کردار مشتاق ایک انجینئر ہے۔جو اپنے گاؤں سے ممبئ ملازمت کی تلاش میں آتا ہے۔کسی کمپنی میں وہ کام کرنے لگتا ہے۔شروع میں اسے کمپنی سے ڈیل کرنے والے client کے لیے entertainment کے ذرائع مہیا کرنے کا کام سونپا جاتا ہے جو call girl کی شکل میں ہوتا ہے۔وہ ایک مذہبی گھرانے کا پرورش کردہ ہے لیکن یہ کام اس لیے کرتا ہے تاکہ اس کی ملازمت مستقل ہو جائے۔ ہندوستان میں انیسویں صدی میں مغربی اور مشرقی تہذیب کا تصادم ایک اہم مسئلہ تھا جسے قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا جن میں قاضی عبدالغفار، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے نام اہم ہیں۔لیکن اب جدید عہد میں یہ تصادم ختم ہو گیا ہے۔بلکہ کمرشیل زندگی کا ایک تقاضہ ہے کہ آپ مغربی تہذیب میں رنگ جائیں۔ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ دقیانوسی خیال کئے جائیں گے۔اپنے ابو کی آمد پر کچھ دنوں کے لیے مشتاق نے اسی لیے شراب ترک کر دی لیکن اپنے دوستوں کو پیٹ درد کا بہانہ دیتا۔کمرشیل زندگی کے کچھ تقاضے ہیں جنھیں بہرحال نبھانا پڑتا ہے۔خواہ آپ کے عقائد و نظریات کچھ بھی ہوں۔مشتاق فجر کی نماز کا پابند ہے۔ کام پر جاتے ہوئے درود پڑھ کر گھر سے نکلتا ہے۔لیکن اسے کمپنی کی پارٹیوں میں شریک ہو کر شراب نوشی کرنا پڑتا ہے۔اس establishment اور کمرشیل زندگی میں گاؤں کے تہذیبی اور مذہبی تصورات بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ایک طرف مشتاق کے مذہبی نظریات ہیں جو اسے فجر کی نماز کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کمرشیل زندگی کے تقاضے بھی ہیں جہاں وہ کلائنٹ کے استقبال کے لیے شراب اور لڑکی کا انتظام کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ شیخ کو لڑکی مہیا کرانے کے بعد اسے عجیب سی جھرجھری ہوتی ہے جو اس کی اندرونی کیفیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ کہانی کا اختتامیہ موضوع کو بھرپور طریقے سے سامنے لاتا ہے جہاں

ٹیبل پر پنکھے کی ہوا میں والدہ کی جانب سے بھیجی گئی سورہ یاسین کی تختی تھرتھرا رہی ہے اور وہیں لڑکی مہیا کرانے کے عوض بنگالی سیکریٹری کی جانب سے دیا گیا پانچ سو کا نوٹ بھی پڑا ہوا ہے، جنھیں اٹھا کر وہ اپنے پرس میں رکھ لیتا ہے اور جنرل مینیجر کی کال ریسیو کرنے کے ساتھ کہانی مکمل ہو جاتی ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ یاسین شریف اور درود کے ورد کی تلقین اسے شر سے بچانے کے لیے کی گئی ہے لیکن اس بڑے شہر کے شر میں آلودہ ہونا اس نوجوان کی مجبوری ہے۔ اسی شر کا حصہ بن کر وہ ترقی کے منازل طے کر سکتا ہے۔ جہاں مذہبی اقدار کی پاسداری اور کمرشیل زندگی کے تقاضے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اس کہانی میں جہاں جنرل مینیجر، مشتاق اور قادر کمرشیل زندگی کی آئینہ داری کرتے ہیں تو وہیں مشتاق کے والدین کا کردار مسلم متوسط طبقہ کے مذہبی گھرانہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

ممبئی کی میکانکی زندگی کو پیش کرتے ہوئے ساجد رشید نے ایک افسانہ لکھا ہے 'ریت گھڑی' جو اپنی تکنیک کی وجہ سے دلچسپی کا باعث ہے۔ جدید عہد میں فطری زندگی سے دوری اور جدید ٹیکنالوجی کے حصار میں قید ہونے کی کہانی ہے۔ چونکہ اس کہانی میں فنکار کا مقصد فطرت، انسیت، یگانگت سے تہی میکانکی طرز زندگی کو پیش کرنا ہے اس لیے اس میں اس نے افراد کو پیش کرنے کے بجائے غیر مرئی اشیا کو افراد کی خصوصیت کے طور پر عمل کرتے دکھایا ہے۔

جس طرح ساجد رشید کے کالم اور اداریے ان کے سیاسی وسماجی شعور کا پتہ دیتے ہیں اسی طرح ان کے افسانوں میں بھی ان کا یہ شعور جھلکتا ہے۔ ان کے کئی مختصر اور طویل افسانے ایسے ہیں جن میں خالص سیاسی موضوعات کو سمویا گیا ہے۔ کہانیاں پل، اندھیرا اندھیرا فش ٹینک، آنسو گیس کا غبار، کٹے ہوئے تار، موت کے لیے اپیل اور مردہ سر کی حکایت وغیرہ سیاسی بدعنوانی، پولیس کی غنڈہ گردی کو پیش کرتی ہیں۔

> **ساجد رشید نے اپنی کہانیوں میں مختلف تکنیک کا استعمال کیا ہے۔فنتاسی، فلیش بیک ، خود کلامی، سادہ بیانیہ ، وضاحتی انداز ، نیم علامتی اور استعاراتی انداز ان کے کہانیوں کہنے کی اہم خصوصیات ہیں۔**

مؤخر الذکر دو افسانے طویل ہیں۔ 'موت کے لیے اپیل' آپ بیتی طرز کا افسانہ ہے۔ اس میں فنکار نے بہت کامیابی کے ساتھ درگا پرشاد کی تنہائی کے ذکر کے ساتھ ساتھ طبقاتی تقسیم، عورتوں کی تعلیم کی اہمیت، جہیز کی لعنت، وسیع و وقیع موضوعات کو سمو دیا ہے۔ درگا پرشاد اس کا مرکزی کردار ہے۔ جو اپنی بیوی کی موت کے بعد احساس تنہائی کا شکار ہے۔ اس کے گھر میں ایک بنگالی بیوہ دیپالی سانیال کام کرنے آتی ہے۔ ذہنی رفاقت اور اپنی تنہائی کو دور کرنے کے لیے درگا پرشاد اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنے بیٹے کے سامنے اس کا تذکرہ کرنے پر بیٹے کی اواخر عمر میں شادی کے تعلق سے

ناپسندیدگی کے اظہار کے سبب وہ دیپا کا خیال دل سے نکال دیتا ہے۔اور کورٹ میں موت کے لیے اپیل کرتا ہے۔

ساجد رشید نے اپنی کہانیوں میں مختلف تکنیک کا استعمال کیا ہے۔فنتاسی، فلیش بیک، خود کلامی، سادہ بیانیہ، وضاحتی انداز، نیم علامتی اور استعاراتی انداز ان کے کہانیوں کہنے کی اہم خصوصیات ہیں۔افسانہ 'ہانکا' میں پوری کہانی انھوں نے شکار اور شکاری کے استعارہ کے ذریعے پیش کی ہے۔ وہ الگ بات ہے کہ وارث علوی نے ان کے اس استعارے کو کہانی کے موضوع سے غیر آہنگ بتایا ہے۔افسانہ 'ریت گھڑی' اور 'مردہ سر کی حکایت' اس کی مثال ہیں۔

اس طرح ساجد رشید کے افسانے اپنی عصریت کے سبب اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ افسانہ کے فن میں جو ابہام اور رمزیت ہوتی ہے وہ ان کے یہاں کہیں کہیں مفقود ہے۔ان کا صحافتی انداز اور مزاج ان کے افسانوں پر زیادہ اثر انداز رہے ہیں۔ ایسا فطری بھی ہے کیونکہ انسان کی شخصیت کا اظہار اس کی تحریروں میں لامحالہ ہوتا ہی ہے۔

❑❑❑

Rehnuma Bano
Dept. of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh-202001 (U.P)
rqhnumabqno48@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

145 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/145 روپے 90092010045326 IFSC:CNRB0019009، A/C:

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail:magazines@ncpul.in, 011-26108159: فیکس 011-26109746: فون

دستخط

محمد شفیع مونس کا جہانِ غزل

صدف نفیس

غزل اردو کی سب سے مشہور صنف ہے۔ ہر دور میں شدید مخالفت کے باوجود اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ بدلتے ہوئے زمانہ نے اسے نئے پہلو سے سجا سنوار کے پیش کیا۔غزل کے موضوعات ہر دور میں تبدیل ہوتے گئے۔کبھی یہ حسن جاناں کی زلفوں کی اسیر ہوئی تو کبھی دار ورسن کی شیدائی۔ اس نے کبھی دل کے نہاں خانوں میں اتر کر شخصیت کے پرت کھولے تو کبھی زماں ومکاں کی قید سے آزاد ہوکر نئے راستوں کی تلاش کی۔غزل حالِ دل سے لے کر عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات اور سیاسی وسماجی تبدیلیوں کی ترجمان رہی ہے۔

بعض شعرا اہم ہوتے ہوئے بھی گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ان ہی شاعروں میں سے ایک محمد شفیع مونس بھی ہیں۔مونس کی پیدائش 1918 میں ضلع مظفرنگر میں ہوئی۔ کچھ دنوں سرکاری ملازمت کرنے کے بعد یہ جماعت سے وابستہ ہوگئے اور تادمِ حیات یہ جماعت اسلامی سے منسلک رہے۔جماعت اسلامی کی مختلف ذمہ داریوں کے علاوہ وہ بہت سی ملی جماعت کے بھی عہدے دار رہے۔اگرچہ اپنی مصروفیات کے سبب ان کے علمی وادبی کارنامے زیادہ نہیں ہیں پھر بھی ان کی شاعری کے دو مجموعے ’متاع حیات‘ 1999 میں اور ’حرف آرزو‘ 2003 میں منظر عام پر آئے۔

انھوں نے کلاسیکی انداز میں غزل گوئی کی لیکن اپنی شاعری کوشعوری طور پر فرسودہ روایتوں اور موضوعات سے دور رکھا۔مولانا

محمد شفیع مونس صاحب نے اپنی شاعری کی بنیاد اس زمانے میں رکھی جب غزل آزاد فضا میں سانس لے رہی تھی۔ اس دور کے غزل گو شعرا نہ مکمل طور پر ترقی پسندی سے متاثر تھے نہ جدیدیت کے مقلد۔ ان کا واسطہ آج کے دور سے تھا۔آج کے دور کا شاعر ان مسائل کا ذکر کرتا ہے جو اس کی ذات سے وابستہ ہوں اور اس کی زندگی کے مختلف شعبوں پر سایا فگن ہوں۔ وہ نئی روشنیوں کا متلاشی بھی ہے اور دیرینہ روایتوں کا پاس دار بھی۔ اس دور کا شاعر گم ہوتی اخلاقی قدروں اور مجروح انسانیت پر نوحہ کناں ہے۔اس دور میں مونس کی شاعری احساس سے زیادہ ادراک سے وابستہ ہے۔ان کی بیشتر شاعری دل سے زیادہ دماغ کو متوجہ کرتی ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد سعی و عمل، پاکیزہ محبت، انسانیت ہمدردی اور حق پروری پر رکھی۔

مونس کی شاعری میں عشق کو عقل پر ترجیح دی گئی ہے کیونکہ وہ انسانیت کی فلاح بہبود کے لیے عقل کے بجائے عشق کو زیادہ کارآمد پاتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں عقل کو مجروح ہوتی انسانیت کا حل تلاش کرنے میں ناکام پاتے ہیں اور عقل والوں کو دل والوں سے انسانیت کا سبق لینے کے لیے کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیں۔

خرد نے صدیوں چھانی خاک کیا کیا
ملی ہے دردِ انساں کی دوا کیا
اب اہل خرد آؤ چلیں اہل دل کے پاس
انسانیت کا تم سے تو درماں نہیں ہوا

اقبال اپنے شعر میں فرماتے ہیں کہ عشق جان ودل کی بازی میں عقل کو مات دے کر آگے بڑھ جاتا ہے اور عقل پس وپیش میں مبتلا رہتی ہے۔مونس بھی فیصلہ کے وقتِ عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ عقل ہمیشہ پس وپیش میں مبتلا رہتی اور نفع ونقصان پر غور کرتی ہے جب کہ عشق جان کی بازی لگا دیتا ہے۔مونس کا ایک شعر اسی لحاظ سے ملاحظہ کریں۔

بہت اونچا مقامِ اہل دانش ہے بجا،لیکن
ہے جان وتن کی ہر بازی تو دیوانوں سے وابستہ

مونس کی شاعری میں انسانیت، غیروں کے درد وغم میں شریک ہونے اور پرائے غم کو اپنا سمجھنے کے اردگرد گھومتی ہے۔ان کا عقیدہ ہے کہ وہ انسان نہیں جس کے دل میں ہمدردی،خلوص، دردمندی نہ ہواور جو غیروں کے غم کا شریک کار نہ ہو۔وہ حقوق العباد کو حقوق اللہ سے الگ نہیں قرار دیتے ہیں۔وہ موجودہ حالات میں بے حسی بے چارگی،خودغرضی کی وجہ انسان کے اندر انسانیت کی کمی اور خودغرضی کو مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے پر امید بھی ہیں۔ان کے اشعار قاری کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کی طرف مائل کرتے ہیں۔مثال کے طور کچھ نمائندہ اشعار دیکھیں۔

یہ غم خوارِی انساں ہی تو مونس آدمیت ہے
اسی سے تو زمانے میں بھرم اپنا رہا باقی

وہ اپنی شاعری میں ایسے دل کی پزیرائی کرتے ہیں جو غم آشنا ہو جس میں سوز ہو جو دردِ انسانیت سے لبریز ہو۔وہ اسی درد کو زندگی کا حاصل قرار دیتے ہیں اور اس کے بغیر انسانی زندگی کو بے مصرف مانتے ہیں۔مونس عملی طور پر بھی انسانیت اور خلوص کا پیکر رہے اور ان کی شاعری بھی ان کے انھیں دلی جزبات کی ترجمانی کرتی ہے۔

نہیں گر دل میں دردِ آدمی تو کچھ نہیں مونس
اسی سازِ محبت سے بھرم قائم ہے انساں کا
دردِدل ہی اصل میں ہے جوہر انسانیت
دردِ دل پر زندگانی کی بنا رکھتا ہوں میں

مونس درد آشنا دل کو ہی محبت کا حقدار سمجھتے ہیں۔ان کی محبت صرف محبوب تک ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی اور کچھ دردِ نہاں بھی۔یہ سوز دل کو جلا بخشتا ہے جس سے محبت کی راہ میں آنے والی لاکھوں دشواریاں بھی اس کے عزم محکم میں حائل نہیں ہو پاتیں۔سوزِ دل کی حدت سے انسان کندن کی طرح نکھرتا ہے اور محبت کے فیضان کو حاصل کرتا ہے۔یہی محبت انسان کو انتشار سے بچاتی ہے اور یکسوئی اور یکتائی بخشتی ہے لیکن محبت میں سارے امتحان یک مشت نہیں ہوتے بلکہ پے در پے ٹھوکریں لگتی ہیں۔مونس کے کلام میں محبت کی اس شروعاتی دور کی ترجمانی بھی ہوئی ہے جب انسان پس وپیش میں مبتلا ہوتا ہے۔

ابھی محبت ہے خام اپنی،شعور پختہ ہوا نہیں ہے
ہجوم غم سے ہے دل پریشاں،نصیب ذوقِ وفا نہیں ہے

لیکن جلد ہی محبت سخت آزمائشوں سے گزر کر عرفان حاصل کرتی ہے اور محبت کرنے والے خود بہ خود ہر مشکلات سے بہ آسانی گزر جاتے ہیں اور محبت سے ہر غم کا مداوا حاصل کرتے ہیں۔

فیضانِ محبت کا کیوں کر ہو بیاں آخر
ہر غم کا مداوا ہے، ہر درد کا درماں ہے

محبت کی سخت ترین راہوں سے بہ خوشی گزر جانے کے باوجود انسان کے دل میں کہیں نہ کہیں ایک کسک باقی رہتی ہے اور اسی کسک کی ترجمانی مونس نے اپنے اس شعر کے ذریعہ کی ہے۔

وفا کی مشکلیں گو حوصلہ ساماں تھیں راہی کو
رہی یہ آرزو پھر بھی نہ کوئی امتحاں ہوتا

مونس عشق اور حیات کے دشوار گزار راستے کو سر کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد اور عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں عمل اور خلوصِ دل سے کی گئی جدوجہد کو ہر کامیابی کا ضامن قرار دیا گیا ہے۔وہ کسی بھی عمل کی کامیابی کے لیے خلوص دل سے کی گئی کوشش کو سراہتے ہیں۔وہ صرف قرار وقول تک ہی انسان کو منحصر نہیں رکھتے بلکہ باعمل ہونا حیات کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں۔

ہو اگر ذوقِ یقیں، عزم مصمم، جہد پیہم بھی
تو سیلابِ بلا سے کیوں نہ بیڑا پار ہو جائے

ہو اقدام عمل سے عہد کی تصدیق بھی ورنہ
قرار و قول سے بوئے وفاداری نہیں آتی

مونس کی نظر میں عشق کا جذبہ پاکیزہ ارمان اور پاکیزگی کی علامت ہے۔ وہ عشق مجازی کو ابوالہوسی کا ذریعہ نہ سمجھ کر پاکیزگی کا عرفاں تصور کرتے ہیں۔عشق کے لیے دل ودماغ کی پاکیزگی کو شرط اول قرار دیتے ہیں۔اسی عمل وقول کی پاکیزگی سے انسان معاملاتِ محبت ہو یا مسائل حیات وہ اچھے اور برے کے شعور سے آشنا ہو ہی جاتا ہے، اور یہی شعور مونس کی شاعری میں انسان اور حیوان کے بیچ کے فرق کا مظہر ہے۔جس کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات میں شامل کیا گیا ہے۔

میرے نزدیک تو فیضان ہوگا یہ محبت کا
شعور انساں کو ہو جائے اچھا کیا، برا کیا ہے

مونس اپنی محبت کو دنیا میں چھپانے اور راز داری برتنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ محبت میں سارے جہاں کو رازداں بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔محبت کے سوز سے زندگی کو ایک نئے سرے سے سنوارنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

محبت تو محبت ہے چھپے پھر کیوں نگاہوں سے
یہی تھی آرزو اپنی زمانہ راز داں ہوتا

مونس عشق کو جنونی احساس تصور نہیں کرتے بلکہ اس کے عرفان سے خود آگہی کو منور کرتے ہیں۔ یہ خود آگہی ان کے لیے کائنات کی آگہی بھی ہے۔ اس آگہی کے ذریعہ انسان حیات و کائنات کے مختلف مسائل پر غور کرنے کے قابل خود کو پاتا ہے۔مونس نے اپنی شاعری میں حیات اور کائنات کے فلسفۂ خودی کا فلسفہ،انسان کی ابتدا اور انتہا، خیر وشر کے مناظر اور ظلم و جبر پہ بحث کی ہے۔مثال کے لیے یہ چنندہ اشعار پیش کرتی ہوں۔

نہ راس آئی کچھ راہ وفا میں بے خودی اپنی
ہوئی روشن شعور آگہی سے زندگی اپنی
ہے بے شک مقامِ سیم وزر بھی زیست میں لیکن
خودی محکم نہ ہو تو قدر دینار و درم کیا ہے

حیاتِ انسانی کی ابتدا اور انتہا پہ ان کے یہ شعر بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

یہ کھل جائے اگر ہم پر ہماری ابتدا کیا ہے
بہت آسان ہے یہ مسئلہ پھر انتہا کیا ہے
نہیں معلوم جس کو زندگی کا مدعا کیا ہے
وہ کیا جانے حقیقت کو بقا کیا ہے، فنا کیا ہے

ان کی شاعری میں تیزی سے بدلتی روایتوں میں انسان کا انسانیت کھونا،لوگوں میں ایک دوسرے سے بے زاری، کشمکش،اور دور جدید میں پیدا شدہ مسائل پر بھی گفتگو ملتی ہے دیکھیں یہ شعر۔

غضب ہے روز افزوں دشمنی انساں کی انساں سے
کہاں سے پھر نظر آئے جھلک اخلاص باہم کی

ان کی شاعری پیغامی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔اس کے ذریعہ وہ جدوجہد، پاکیزگی، اعلیٰ اخلاق، ہمدردی، ہمت وحوصلہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ وہ عشق ومحبت کے معاملات کی مختلف جہتوں کو شاعری میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب سے گلہ بھی کرتے ہیں اور اسے یاد بھی کرتے ہیں۔عشق مجازی سے متعلق ان کی شاعری روایتی شاعری سے مختلف ہے۔وہ محض رسماً ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں تا کہ قاری کو ان کے موضوعات میں تنگی کا احساس نہ ہو۔ان کی عشقیہ شاعری محض لفاظی نہیں ہے بلکہ اس میں نازک خیالات، دلی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔مثال کے لیے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وہ لمحاتِ محبت ہائے اکثر یاد آتے ہیں
کہ جن لمحات میں تم سے نہ تھا کوئی گلہ مجھ کو
آرزوئیں بھی ہماری تھیں بڑی موقع شناس
چھپ گئیں دل میں کبھی رخ پر نمایاں ہوگئیں

ان کی غزلوں پر علامہ اقبال کے فکر وفلسفہ کا واضح اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں چند کلیدی الفاظ ہیں۔مثال کے طور پر متاع حیات میں 'شان کی شایاں' اور حرف آرزو میں 'شائستگی' وغیرہ۔ ◻◻◻

Sadaf Nafees
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
sadafmunmun@gmail.com

سیاسی، سماجی تعلیمی انقلاب اور خواتین

شجاع الدین شاہد

معاشرے کی تکمیل میں خواتین کا کردار اہم رہا ہے۔ چاہے وہ سیاسی ہو، سماجی ہو، چاہے تعلیمی میدان، ہر طرف اس نے کامیابی کے پرچم لہرائے، اُن کی قربانیوں کو ہم بھلا نہیں کرسکتے۔

رضیہ سلطانہ، لکشمی بائی، بی اماں، فاطمہ شیخ، میرابائی، چاند بی بی سے لے کر بیگم حضرت محل تک متعدد خواتین تاریخ کے گم شدہ اوراق میں پوشیدہ ہیں جن کی کامرانیاں اور قربانیاں نئی نسل تک پہونچانا ہمارا فریضہ ہے۔ حکمرانی تو صرف مرد ہی کرسکتا ہے۔ عورت تو سماجی و معاشرتی ڈھانچے کا ایک حصہ ہے، اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے والی خاتون کا نام رضیہ سلطانہ ہے۔

رضیہ سلطانہ1202 میں بدایوں میں پیدا ہوئیں۔ وہ دلّی کی پہلی اور آخری خاتون حکمراں رہی ہے، بادشاہ التمش نے اُس کی جنگی تربیت اور تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ وہ جنگی ماہر بھی تھی اور گھوڑسواری کے فن میں بھی یکتا تھی۔ التمش نے اسی خصوصیت کی بنیاد پر رضیہ سلطان کو اپنے بیٹوں پر فوقیت دی اور اُسے اپنا جانشین مقرر کیا۔ مگر مردوں کی بالا دستی والے سماج نے ایک خاتون کے زیر نگیں رہنا منظور نہ کیا اور بغاوت کی آگ پھیلنے لگی۔ جب التمش نے رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشیں مقرر کیا تو ہر طرف چہ می گوئیاں ہونے لگیں تو اس کے بھائی رکن الدین نے تخت پر قبضہ کرلیا۔ سب کا خیال تھا کہ رضیہ عام عورتوں کی طرح رو دھو کر چپ ہوجائے گی۔ مگر وہ خاموش نہیں بیٹھی اس نے دلی کے لوگوں کی مدد سے 1236 میں بھائی کو شکست دے کر تخت پر قبضہ کرلیا۔ اس باہمت خاتون نے ثابت کردیا کہ عورت کمزور نہیں طاقتور بھی ہے۔ جب وہ دربار میں حاضر ہوتی تو جنگی لباس زیب تن کئے ہوتی جس کی وجہ سے مخالفین میں چہ میگوئیاں اور سازشیں ہونے لگیں۔ اس کے دورِ اقتدار میں تعلیم کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ جگہ جگہ لائبریریاں قائم کی گئیں۔

رضیہ سلطانہ جاذب النظر شخصیت کی مالک تھی۔ اسے پسند کرنے والوں میں بھٹنڈہ کا حاکم ملک الطّونیا بھی شامل تھا مگر وہ اپنا دل حبشی غلام جمال الدین یاقوت کو دے چکی تھی، جب ملک الطّونیا کو خبر ملی تو رقابت کی آگ میں جل اٹھا۔ اس نے دہلی کے اُمرا اور باغیوں کو ساتھ ملا کر رضیہ کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ اس معرکے میں یاقوت مارا گیا اور رضیہ کو قید کرلیا گیا۔ قید سے رہائی کے لیے ملک الطّونیا نے رضیہ سے شادی کی شرط رکھی۔ مجبوراً رضیہ نے یہ شرط مان لی کیونکہ اسے دوبارہ دلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے اک مضبوط سہارے کی ضرورت تھی۔ باغیوں نے اس کے بھائی کو دوبارہ بادشاہ بنادیا۔ اسے تخت سے بے دخل کرنے کے لیے ملک الطّونیا کو اکسایا، پھر ایک جنگ میں انھیں شکست ہوئی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ جان بچانے کے لیے کیتھل یا کرنال گئیں جہاں ڈاکوؤں کے ہاتھوں 15 اکتوبر1240 کو دونوں میاں بیوی کا قتل ہوگیا۔ اس کے بھائی بہرام

شاہ کے سپاہیوں نے ان لاشوں کو پہچان کر دلی پہنچایا اور پھر انھیں پرانی دلی میں سپردخاک کر دیا گیا۔

عورت صرف صنفِ نازک ہی نہیں بلکہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح دشمن کے سامنے صف بستہ ہوسکتی ہے ۔احمد نگر کی بیٹی ''چاند بی بی'' جسے چاند سلطانہ بھی کہا جاتا ہے کی مثال تاریخ کے صفحات میں موجود ہے ۔ اُس نے احمد نگر قلع کی حفاظت کے لیے مغلوں کی ایک بڑی فوج کے سامنے سرخم نہیں کیا۔ وہ فولادی حوصلے والی جنگجو خاتون تھیں ۔ احمد نگر قلعہ کی جو دیوار گری تھی اس نے اسے ایک رات میں ہی تعمیر کروالیا تھا۔مغلوں کی فوج اس قلعے کو تسخیر کئے بنا ہی خالی ہاتھ لوٹ گئی ۔مگر 1598 میں مغل فوج پھر حملہ آور ہوئی اور قلعے کے قلعہ دار کی سازش کے تحت 1600 میں چاند بی بی کو قتل کر دیا گیا اور احمد نگر قلعہ مغلوں کے تسلط میں چلا گیا۔

بے جا سماجی بندھنوں کی مخالفت کرنے والی میرا بائی کا جنم 1498 میں راجستھان کے میڑتا گاؤں کے پاس چوکڑی گاؤں میں ایک معزز راجپوت گھرانے میں ہوا۔ میرا بائی جس عہد میں سانس لے رہی تھی اس وقت عورتوں پر بے جا پابندیاں عائد تھیں ۔مردوں کی بالا دستی والے معاشرے میں عورتیں چار دیواری میں مقید تھیں ۔ یہ زمانہ پندرہویں صدی کا ہے جس میں ایک شاہی گھرانے کی لڑکی سارے رسم ورواج سے انحراف کرتی ہوئی اپنے خاندان اور سماج سے لڑ جاتی ہے ۔میرا بائی کرشن کے پریم میں پاگل سی ہوگئی ۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے صرف اور صرف اپنا محبوب کرشن ہی نظر آتا ہے ۔یہی پاکیزہ جذبات اُس سے بھجن اور پداولی لکھواتے ہیں ۔عورت کی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ لاج یا شرم وحیا ہے جس سے میرا بائی نے بغاوت کی اور اپنے ہی خاندان اور سماج سے دشمنی مول لی۔

سماج سے بغاوت کی سزا اسے ملی ۔ اسے زہر بھی دینے کی کوشش کی گئی ۔قیاس ہے کہ 1547 میں دوار کا نگری (گجرات) میں ان کی روح پرواز کر گئی اور گردھر گوپال میں سما گئی ۔ اس جرأت کے ساتھ بے زبان عورتوں کو آزادیٔ اظہار کا حوصلہ دے گئی۔

راج ماتا جیجا بائی کا جنم 1598 میں سندھ کھیڑ راجا (مہاراشٹر) میں ہوا۔ وہ بذات خود ایک گھوڑ سوار ،تلوار باز ، اور قائدانہ صلاحیت کی مالک تھی ۔ جیجا بائی کے شوہر شاہ جی بھوسلے ایک صوبے دار تھے جو اکثر مہم پر رہتے ۔ایسے میں جیجا بائی نے شیواجی کی پرورش میں کوئی کمی نہیں ہونے دی ۔وہ انھیں رامائن اور مہابھارت کی کہانیاں سنا کر باطنی طور پر مضبوط کرتی اور دوسری طرف اچھے اچھے ماہر اتالیق سے تلوار بازی اور گھوڑ سواری کی مشق کراتی ۔انھوں نے ایک وطن پرست سپہ سالار کی طرح شیواجی میں وہ تمام خوبیاں بھر دیں جو ایک بہادر میں ہوتی ہیں ۔جیجا بائی کی تعلیم اور رہنمائی نے شیواجی میں قائدانہ صلاحیت پیدا کر دی ۔ جیجا بائی نے شیواجی کو یہ درس دیا کہ ہمیشہ کمزوروں کی مدد اور عورتوں کا احترام کریں۔

شیواجی کے دور حکومت میں مذہبی رواداری مستحکم تھی ۔ان کی فوج میں ماولے اور مسلم فوجی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ۔ پرتاب گڑھ کے قلعے میں جہاں انھوں نے مندر بنوایا وہیں مسلم فوجیوں کے لیے مسجد بھی بنوائی جو آج بھی موجود ہے ۔ان کا اپنی فوج کو حکم تھا کہ جب بھی کسی گاؤں سے گزرو تو مذہبی عبادت گاہوں اور فصلوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔عورتوں بچوں اور بزرگوں کا استحصال نہ کرو ۔اپنی ماں کا دیا ہوا درس انھوں نے ہمیشہ یاد رکھا۔حقیقت تو یہ ہے کہ ایک ماں کی صحیح تربیت اور پرورش ہی ایک بچے میں نیک صفات پیدا کر سکتی ہے ۔یہ جیجا بائی نے ثابت کر دکھایا۔

اپنے دیش اور مادر وطن کے لیے جان قربان کر دینے والی خواتین کی فہرست میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا نام نمایاں نظر آتا ہے ۔لکشمی بائی کا جنم 1828 میں وارانسی میں ہوا۔ انھیں 1857 کے غدر کے دوران ہندوستانیوں میں ہمت پیدا کرنے اور ان کی رہنمائی کرنے کے لیے بھی یاد کیا جاتا ہے ۔ جنگ آزادی کی یہ پہلی لڑائی تھی ۔لکشمی بائی دیش کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی ایک اہم خاتون تھیں ۔ وہ سیاسی بصیرت کی حامل خاتون تھیں ۔انھیں احساس تھا کہ ہم اگر منتشر رہے تو

دشمن کوزیر نہیں کر سکتے۔ اس لیے انھوں نے تاتیا ٹوپے، نانا صاحب، منگل پانڈے، بخت خان جیسے سرفروشوں کو متحد کیا۔ انھیں اتحاد کی دعوت دی۔ انگریزوں کی یلغار کو اس اتحاد نے کسی حد تک روکا بھی، مگر انگریزوں کی حکمت عملی کام آئی اور وہ 1857 کا غدر جیت گئے۔ لکشمی بائی کو دوطرفہ مقابلہ کرنا پڑا، ایک تو فرنگیوں سے نبرد آزما رہی تو دوسری طرف ان سے بھی لڑی جو انگریزوں کے وفادار تھے۔ انگریز بھی اس کی بہادری کے معترف تھے کیونکہ میدان جنگ میں وہ اپنے بچے کو پیٹھ پر باندھ کر میدان جنگ میں اترتی تھی۔ آخر کار اس بہادر خاتون نے میدان جنگ میں اپنے بادل نامی گھوڑے پر 1858 میں جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت اس عمر 29 سال کی تھی۔ لکشمی بائی کا دنیا کی طاقتور ترین عورتوں میں شمار ہوتا ہے۔

ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا تو انھوں نے دیگر اقوام کے اندر نفرت کے بیج بونا شروع کر دیے۔ نفرت کی دیوار کھڑی کرنی شروع کر دی۔ انگریزوں کی اس سازش کے خلاف آواز بلند کرتی ہوئی ''بیگم حضرت محل'' نظر آتی ہیں۔ ان کا نام سنتے ہی جنگ آزادی کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ وہ پہلی سرگرم عمل خاتون رہنما تھیں جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ وہ نواب واجد علی شاہ کی شریک حیات تھیں۔ ایک خاتون ہوتے ہوئے بھی انھوں نے برطانوی سامراج وایسٹ انڈیا کمپنی سے لوہا لیا۔ برطانوی حکومت کی تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر کے تحریک آزادیٔ ہند 1857 کو ایک نیا موڑ دیا۔ ان کی پیدائش 1820 کو فیض آباد میں ہوئی۔ جب 1856 میں واجد علی شاہ کو انگریزوں نے جلاوطن کر کے کلکتہ بھیج دیا تو بیگم حضرت محل نے اودھ کی باگ ڈور سنبھالی اور انگریز مخالف عوام کی رہنمائی کی۔

بیگم حضرت محل ایک ایسی قائد تھیں جنھوں نے جابر حکومت کے سامنے سر خم نہیں کیا۔ یہ ثابت کیا کہ عورت صرف گھر کی چار دیواری کا نظام ہی خوبی سے نہیں سنبھالتی بلکہ وقت آنے پر دشمنوں کو بھی کھدیڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ آخر کار جب انگریزوں نے محل پر قبضہ کر لیا تو انھوں نے نیپال میں پناہ لی اور 1879 میں کاٹھمنڈو میں آخری سانس لی۔

علی برادران کی والدہ ''بی اماں'' امروہہ میں 1852 میں پیدا ہوئیں۔ اس مجاہد خاتون کی کوکھ سے محمد علی جوہر اور شوکت علی جیسے مجاہدین پیدا ہوئے۔ بی اماں ہندوستان کی سیاسی افق پر پہلی خاتون تھیں جنھوں نے تحریک آزادی کے لیے نہ صرف خود کو میدان عمل میں متحرک رکھا بلکہ اپنے دونوں فرزند علی برادران کے اندر بھی حب الوطنی کا جذبہ پیدا کیا۔ انھیں تحریک آزادی کی پہلی مجاہد خاتون کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ بی اماں کی عمر 28 برس کی تھی کہ ان کے شوہر عبدالعلی خان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے بیوگی کا ماتم منانے کی بجائے اپنے دونوں فرزند کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی۔ ایسی ماں جس کے خاندان کے کئی افراد نے 1857 کی جنگ میں جام شہادت نوش کیا، وہ ماں اپنی گود میں پلنے والے بچوں کو وراثت میں قربانی اور حب الوطنی کے علاوہ اور کیا دے سکتی تھی؟۔ وطن پرست بی اماں کا انتقال 1924 کو دہلی میں ہوا اور وہیں دفن ہوئیں۔

تعلیمی انقلاب کی مہم میں دو خواتین ''ساوتری بائی پھولے اور فاطمہ شیخ''، اہم ہیں۔ اس وقت بہت سی رسمیں ہمارے سماج میں رائج تھیں، جیسے طبقاتی نظام، بال وواہ، اندھی مذہبی تقلید وغیرہ۔ مگر کچھ اصلاح پسند انگریز بھی اصلاح چاہتے تھے۔ انگریزوں کی اس پالیسی کا سماجی مصلحین نے فائدہ اٹھایا۔ سماجی مصلحین میں راجہ رام موہن رائے، ایسی شخصیت تھی جس نے ستی کی رسم کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے کم عمر کی شادی پر بھی پابندی لگانے کی سرکار سے گذارش کی۔

موہن رائے کی اس مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے سماجی مصلح جیوتی با پھولے نے مظلوم خواتین کے لیے آواز اٹھائی۔ طبقاتی نظام

کی پرزور مخالفت کی۔ پھولے اس حقیقت سے واقف ہو چکے تھے کہ خواتین کو بااختیار، خودکفیل، بنائے بغیر اک مضبوط صحت مند معاشرے کی تشکیل ناممکن ہے۔ اِسی خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ عملی طور پر میدان میں کود پڑے۔ اس انقلابی مہم میں اُن کی بیوی ساوتری بائی اور فاطمہ شیخ ہر قدم پر ان کے ساتھ رہیں۔

ساوتری بائی کی پیدائش 3 جنوری 1831 کو نائے گاؤں (ستارہ، مہاراشٹرا) میں ہوئی۔ چونکہ اس زمانے میں بچپن کی شادیوں کا رواج عام تھا، اس لیے 9 سال کی عمر میں ان کی شادی 13 سال کے عمر کے جیوتی با پھولے سے کر دی گئی۔ جیوتی با پھولے نے ساوتری بائی کو خود ہی زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ وہ پہلی ہندوستانی تربیت یافتہ خاتون معلّمہ بنیں۔ وہ بہت سی خوبیوں کی مالک تھیں۔ مراٹھی زبان کی پہلی جدید شاعرہ کے طور پر بھی انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ صوفی سنتوں کا اثر ساوتری بائی کے کلام پر بھی پڑا۔ ساوتری بائی کی شاعری مذہبی رنگ لیے ہوئے ہے۔ جس میں بھگوان سے لَو لگانے کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات کی عکاسی بھی ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ تعلیم کی اہمیت کو ان کی شاعری میں جگہ دی گئی ہے۔

جیوتی با پھولے کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے انھوں نے تعلیم نسواں اور پسماندہ طبقے میں تعلیم عام کرتے ہوئے کئی مصائب کا سامنا کیا۔ انھوں نے پہلے لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے۔ بیواؤں کے حقوق کے لیے جد جہد اور فرسودہ رسومات کے خلاف آواز بلند کی۔ 1890 میں ان کے شوہر کے انتقال کے بعد ''ستیہ شودھک منڈل''، جس کی بنیاد جیوتی با نے رکھی تھی کے کام کو سنبھالا۔

عورتوں، یتیموں، بیواؤں اور پسماندہ طبقات کے حقوق کے لیے لڑائی لڑنے والی پہلی خاتون ساوتری بائی کا نام تاریخ میں امر ہو گیا۔ اس خاتون نے سماج کو یہ باور کرایا کہ دیہات کی اک عام سی لڑکی خواتین کے لیے اک مثال قائم کر سکتی ہے۔ تعلیمی و سماجی مساوات کو مدنظر رکھتے ہوئے انقلاب بھی لا سکتی ہے اور اپنی فکر کو اک نئی جہت دے کر ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔ ساوتری بائی پھولے نے خواتین کے لیے ظلمتِ شب میں جو علم کی مشعل روشن کی تھی وہ آج بھی بڑی آب و تاب کے ساتھ روشن ہے۔

تعلیم نسواں اور تعلیم بالغان کی تحریک میں ساوتری بائی کا ساتھ دینے والوں میں فاطمہ شیخ کا نام سرفہرست ہے۔ ساوتری بائی کی صحبت میں رہ کر وہ بھی تربیت یافتہ استانی کے مقام تک پہنچیں۔ پہلی ہی ملاقات میں فاطمہ شیخ ساوتری بائی سے متاثر ہو چکی تھیں۔ چونکہ دونوں ہی ہم عمر تھیں اس لیے جلد گھل مل گئیں۔ فاطمہ شیخ کی پیدائش 1831 کو ہوئی۔ وہ انیسویں صدی میں تعلیم نسواں کی اک اہم اور توانا آواز ہیں۔ وہ پہلی تربیت یافتہ مسلم خاتون معلّمہ تھیں۔ ان کے بھائی عثمان شیخ جیوتی با پھولے کے ہم جماعت تھے۔

فاطمہ شیخ کی خدمات سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ انیسویں صدی میں تعلیم نسواں کے حق میں آواز بلند کرنا آسان نہ تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یکم فروری 1848 کو انھیں کے گھر میں لڑکیوں کے لیے ایک لائبریری اور اسکول کی بنیاد رکھی گئی۔ غالباً اسے لڑکیوں کا پہلا اسکول سمجھا جاتا ہے۔ فاطمہ شیخ کی فکر اور ان کا وژن بلند اور وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج مسلم معاشرہ تعلیم نسواں کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہ وژن فاطمہ شیخ نے 170 سال قبل ہی پیش کیا تھا۔ اُنھوں نے اس عہد میں تعلیم نسواں کی مہم کا آغاز کیا جب مسلمانوں میں اس کا تصور بھی نہیں تھا۔

9 اکتوبر 1900 میں اس پہلی معلّمہ خاتون کا انتقال ہو گیا۔ وقت کے دھند لکے میں ان کی کاوشیں اور محنت کہیں کھو سی گئی ہیں۔ ان کی قربانیاں اور جد وجہد کی داستانیں نئی نسل تک پہنچانا بہت ضروری ہے۔

❑❑❑

Shujauddin Shahid
C-5, Saymbhu.Chs.No.1,
Near Care Hospital, Mhadacolony,
Malwani, Malad (W)
Mumbai-400095
Mob: 9969039485
Email: shahid.shujauddin59@gmail.com

شازیہ ممتاز

گوجر بکروال خواتین کو درپیش مسائل

کسی بھی معاشرے کی ترقی میں عورتوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔عورت معاشرے کا بنیادی ستون ہوتی ہے۔ایک عورت ہی کسی معاشرے کو بلندی تک لے جاسکتی ہے اور اس کے زوال کی وجہ بھی ایک عورت ہی بنتی ہے۔کیوں کہ کسی بھی معاشرے کی ترقی تب ہی ممکن ہوسکتی ہے جب ایک عورت کو اس کے بنیادی حقوق مل سکیں۔یہ کسی بھی کنبے اور خاندان کا بنیادی جز ہوتی ہے۔

آزادی سے پہلے ہندوستانی عورتوں کو بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا۔ان کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑھتا تھا۔وہ اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم رہتی تھیں۔لیکن آزادی کے بعد ہندوستانی سماج نے تیزی سے ترقی کی ہے۔ہندوستانی آئین کے مطابق چل کر مردوں اور عورتوں میں کسی حد تک برابری دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کے علاوہ پسماندہ طبقات کے لیے خصوصی سہولیات پر زور دیا گیا۔تغیر کے اس عمل نے پسماندہ طبقات میں بھی تبدیلی لائی ہے۔لیکن اس کے برعکس بھی قبائلی خواتین کا روایتی طور پر پسماندہ طبقوں میں درجہ کم رہا ہے۔اس وجہ سے یہ قوم ابھی تک پچھڑی ہوئی ہے۔اگر دیکھا جائے تو معاشرے کی فلاع و بہبود میں خواتین کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔اگر خواتین کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا جائے گا تو اس سماج و معاشرے کے لیے ترقی کی منازل طے کرنا مشکل ہوگا۔

ہندوستان میں بہت سارے قبائل کے لوگ رہتے ہیں جن میں سے ایک بڑا قبیلہ گجر بکروال ہے۔اس قبیلے کے لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہیں۔ہماچل پردیش، گجرات، راجستھان جیسی ریاستوں کے ساتھ ساتھ کافی تعداد میں گجر بکروال قبیلے کے لوگ جموں کشمیر میں بھی آباد ہیں۔اس قبیلے کے لوگ اکثر بے گھر ہوتے ہیں جن کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔یہ لوگ اکثر گرمیوں کے موسم میں اپنے مال مویشی کو لے کر دور دراز کے پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے ہیں جبکہ سردیوں کے موسم میں پھر میدانی علاقوں میں آ جاتے ہیں۔ان لوگوں کو بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑھتا ہے۔خاص کر گوجر بکروال خواتین مندرجہ ذیل مسائل سے دوچار ہوتیں ہیں۔

ایک عورت کے سر گھر کی بہت ساری ذمے داریاں ہوتی ہیں جنھیں وہ بخوبی نبھاتی ہے اور سماج کو چلاتی ہے۔لیکن وہ بہت سارے سماجی مسائل کے ساتھ جوجھ رہی ہوتی ہیں۔ہم اگر ٹرائیبل گوجر بکروال لوگوں کی بات کریں تو زیادہ تر یہ لوگ اکثر چلتے رہتے ہیں۔ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا۔دوردراز رہنے والی یہ عورتیں بے شمار مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ان کو سماج میں وہ مقام،وہ رتبہ،وہ عزت،وہ شہرت نہیں مل سکتی جس کی ایک عورت حقدار ہوتی ہے۔گھریلو تشدد کی بات کریں یا پھر سماجی اونچ نیچ کی،

یہ خواتین کہیں بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتیں۔ایک بیٹی پیدائش سے لے کر بڑھاپے تک بے شمار تشدد سہتی ہے۔انھیں پڑھائی جیسی دولت سے محروم رکھا جاتا ہے۔گوجر بکروال قبیلے میں اگر کوئی بیٹی پیدا ہوتی ہے تو والدین ناراضگی ظاہر کرتے ہیں۔اس کے بعد لڑکوں کو اسکول بھیجا جاتا ہے اور لڑکیوں کو گھر کے کام کاج میں لگا دیا جاتا ہے۔ان کی پڑھائی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔کہا جاتا ہے کہ بیٹیوں کو پرائے گھر میں جانا ہے۔آج کے دور میں اگر دیکھا جائے تو شہروں میں رہنے والے لوگ بیٹیوں کی پڑھائی کی طرف توجہ دیتے ہیں لیکن دور دراز گاؤں میں اس قبیلے کی لڑکیوں کے ساتھ وہی پرانا سلوک کیا جاتا ہے۔والدین بیٹیوں کو پڑھانے کے بجائے مال مویشی میں لگا دیتے ہیں۔ایک عورت اگر پڑھی لکھی نہیں ہوگی تو اس کے لیے آج کے دور میں جینا بہت دشوار ہے۔دنیا کے ہر کسی مذہب میں علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ایک عورت اگر پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار ہوگی تو اس کی اولاد بھی تہذیب یافتہ اور با ادب ہوگی۔گوجر بکروال لڑکیوں کو پڑھائی کے لیے وہ سہولیات نہیں دی جاتیں جس کی وہ حقدار ہوتی ہیں۔ان کی بہت کم عمر میں شادی کر دی جاتی ہے تو ان کو سسرال کے ظلم وتشدد برداشت کرنے پڑتے ہیں۔پڑھائی کے بغیر ان کو باہر کی دنیا کا پتہ تک بھی نہیں ہوتا ہے۔یہاں تک کے آجکل سب کام آن لائن ہو رہے ہیں۔وہ اگر بیمار ہوتی ہیں پہلے تو دور دراز علاقوں میں سڑکوں کی وہ سہولیات نہیں ہوتیں ۔وہ ہسپتال پہنچ ہی نہیں سکتیں اگر پہنچ بھی جائیں تو ان کو ڈاکٹر سے اپوئنٹمنٹ لینے کا پتہ نہیں ہوتا۔ان کے لیے ہسپتال میں جا کر اپنی صحت چیک اپ کروانا بھی مشکل ہوتا ہے۔وہ اپنے بچوں کی تربیت اچھے سے نہیں کر پاتیں۔ان کو سماج میں بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔جیسے کچھ عرصہ پہلے کشمیر میں ایک انسانیت کو شرمسار کرنے والا واقعہ پیش آیا۔جہاں کچھ نوجوانوں نے ایک گوجر بکروال عورت کے ساتھ جنسی زیادتی کی اور پھر اس کا قتل کر دیا گیا۔ایک طرف یہ بے گھر خواتین دور دراز پہاڑی علاقوں میں برف،ٹھنڈ اور کھٹن سفر سے مقابلہ کرتی ہیں،دوسری جانب ان کی ساتھ اس طرح کی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔

ایک مضبوط اور صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے خواتین کو بااختیار بنانا بہت ضروری ہے۔کسے بھی سماج کی ترقی تب ہی ممکن ہوسکتی ہے جب تمام لوگوں کو برابر کے حقوق دیے جائیں۔چاہیے وہ مرد ہوں یا عورت۔ہم اگر ہندوستان کے آئین کی بات کریں تو سماج میں برابری کے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے شڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کو پولیٹیکل ریزرویشن دی گئی ہے جیسے دفعہ 330 کے تحت شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کو لوک سبھا میں نشستوں کے لیے ریزرویشن کی بات کی گئی ہے۔اسی طرح دفعہ 332 (Article 332) میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول ٹرائب کے لیے ریاستی اسمبلی میں نشستوں کے لیے ریزرویشن دی گئی ہے۔اور Article 338 اور Article 338A کے تحت National commission for scheduled castes اور National commission for scheduled Tribes بنائے گئے ہیں جو ان طبقات کے حقوق کی بات کر رہے ہیں اور آواز اٹھا رہے ہیں۔اسی طرح شیڈول ٹرائب عورتوں کے لیے بھی الگ سے panchayats اور Municipalities میں نشستوں پر ریزرویشن دی گئی ہے۔اگر ہم دیکھیں گوجر بکروال خواتین آج بھی اسی پرانے دور میں جی رہی ہیں۔ان کا سیاست میں کوئی رول نہیں ہے۔وہ آج بھی گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رہتی ہیں۔کسی بھی قوم کی ترقی تب ہی ممکن ہوتی ہے جب ایک عورت اس کے حقوق دیے جائیں اور جب ایک عورت ہی سیاست میں جائے گی کسے عہدے پر پہنچے گی تو وہ ایسی کئی پالیسیاں بنائے گی جو عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں۔ہم اگر گوجر بکروال عورتوں کی بات کریں تو ان کا سیاست میں صرف اتنا ہی رول رہتا ہے کہ وہ بس ووٹنگ والے دن کسے کے کہنے پر ووٹ ڈال دیں۔اس کے علاوہ سیاست میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔کسی سماج اور طبقے کی ترقی تب ہی ہوتی ہے جب عورتیں اس میں برابر کی شریک ہوں۔ عورتوں کو بیدار ہونے کی بہت ضرورت ہے۔یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب عورتیں پڑھی

لکھی ہوں گی۔آج اگر دیکھا جائے تو پہلے کے مقابلے میں لڑکیاں ہر میدان میں کافی آگے نظر آرہی ہیں۔ لیکن گوجر بکر وال عورتیں آج بھی کہیں نہ کہیں ہر میدان میں پیچھے ہیں۔عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔اگر ایک عورت نمائندہ بن کر آگے جائے گی تو وہ سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو زیادہ باریکی سے جانچ کر اس کا حل ڈھونڈیں گی۔ایسی کئی سماجی برائیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔یہ نہ صرف ایک طبقے بلکہ پورے ملک کی ترقی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔ہر ایک شعبے میں عورتوں کی کم شرکت سماج کو بہتر بنانے اور ملک کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

خواتین کا معاشی طور پر خود مختار ہونا بہت ضروری ہے۔ایک خودمختار عورت اپنا فیصلہ خود سے لے سکتی ہے۔اور ایک سماج و معاشرے کی ترقی کے لیے عورتوں کا خودکفیل ہونا لازمی ہے۔

گوجر بکروال خواتین بہت سارے معاشی مسائل سے دوچار ہوتی ہیں۔ان کے پاس ذرائع کی کمی ہوتی ہے۔روزگار کے بہت کم مواقع دستیاب ہوتے ہیں۔ان کا کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہوتا۔ ان کو کسی کا محتاج ہو کر زندگی بسر کرنی پڑ رہی ہے۔آج اگر دیکھا جائے تو خواتیں کافی آگے نکل چکی ہیں۔کسی بھی شعبے میں دیکھا جائے تو خواتین برابر کی شریک ہوتی ہیں۔لیکن اگر گوجر بکر وال خواتین کی بات کی جائے یہ بہت کم آگے نکلتی ہیں۔سرکاری نوکری کی بات کی جائے،یا تجارت میں حصہ داری کے لحاظ سے دیکھا جائے ان کی تعداد بہت کم ہے۔خواتیں کے لیے معاشی خود مختاری،حکومتی اور سماجی اداروں میں برابری کی بنیاد پر ملازمتیں صرف ایک سماج اور معاشرے کے لیے ضروری نہیں بلکہ پورے ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔خواتین اگر مالی طور پر خودمختار ہوں گی تو وہ اپنا کوئی بھی کاروبار شروع کر کے آگے کئی عورتوں کو روزگار فراہم کر سکتی ہیں۔مغربی ممالک کی ترقی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہاں مرد اور عورت ہر شعبے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ایک گھر کے اگر چار افراد ہیں تو وہ چار کے چار کچھ نہ کچھ روزگار کرتے ہیں۔یہ نہیں کہ گھر کا صرف ایک فرد کماتا ہو اور باقی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں۔ملک ہندوستان میں بھی آج خواتین ہر لحاظ سے کافی آگے ہیں۔لیکن کچھ طبقہ جات ایسے ہیں جو ابھی تک کافی پچھڑے ہوئے ہیں۔جیسے گوجر بکروال طبقہ کے لوگ خاص کر خواتین صرف مال مویشی پالنے ہی کو ہی اپنی زندگی سمجھتی ہیں۔ شہروں میں کارخانوں اور انڈسٹریز میں اکثر خواتین کام کر سکتی ہیں اور اپنے ہنر سے ترقی کے منازل طے کر سکتی ہیں۔گوجر بکروال خواتین ان سہولیات سے محروم رہتی ہیں۔یہ نہیں کہ ان کے پاس ہنر کی کمی ہے بلکہ ان کو اپنا ہنر دکھانے کے لیے ایسے مواقع ہی دستیاب نہیں ہوتے۔اس کے علاوہ اگر کوئی عورت شوق بھی رکھتی ہے تو وہ مالی طور پر اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ خودمختار ہو کر آگے بڑھ سکے اور ملک کی ترقی میں اپنا حصہ دے سکیں۔

Awareness camp کا انعقاد کرنا چاہیے جن سے جانکاری حاصل کر کے یہ خواتین آگے آئیں اور آگے بڑھ کر ترقی حاصل کر سکیں۔اگر ایک عورت اپنی کوئی تجارت شروع کرے گی تو اس کو دیکھ کر کئی خواتین اس طرف راغب ہوں گی۔اس کے ساتھ ان طبقات کو چاہئے کہ وہ اپنی محدود سوچ کو ختم کر کے آگے بڑھیں اور لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ دیں،اور اپنے آپ میں وہ قابلیت پیدا کریں جس سے وہ ہر شعبے میں آگے بڑھ سکیں۔ایسی خواتین جو کوئی ہنر رکھتی ہوں وہ بھارت سرکار کی ایسی کئی skill development schemes وغیرہ سے فائدہ اٹھا کر اگر وہ پہلے اپنا کوئی چھوٹا business ہی شروع کریں جیسے پولٹری،ڈیری وغیرہ تو اس سے بھی وہ آگے بڑھ کر بہت دور تک جا سکتی ہیں اور مالی طور پر خود مختار ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتی ہیں۔

□□□

Shazia Mumtaz
Post office:Hari
R/o Vllage Marhote
Tehsil Surankote
Distt.Poonch- 185121 (J & K)
mumtazahmed9530@gmail.com

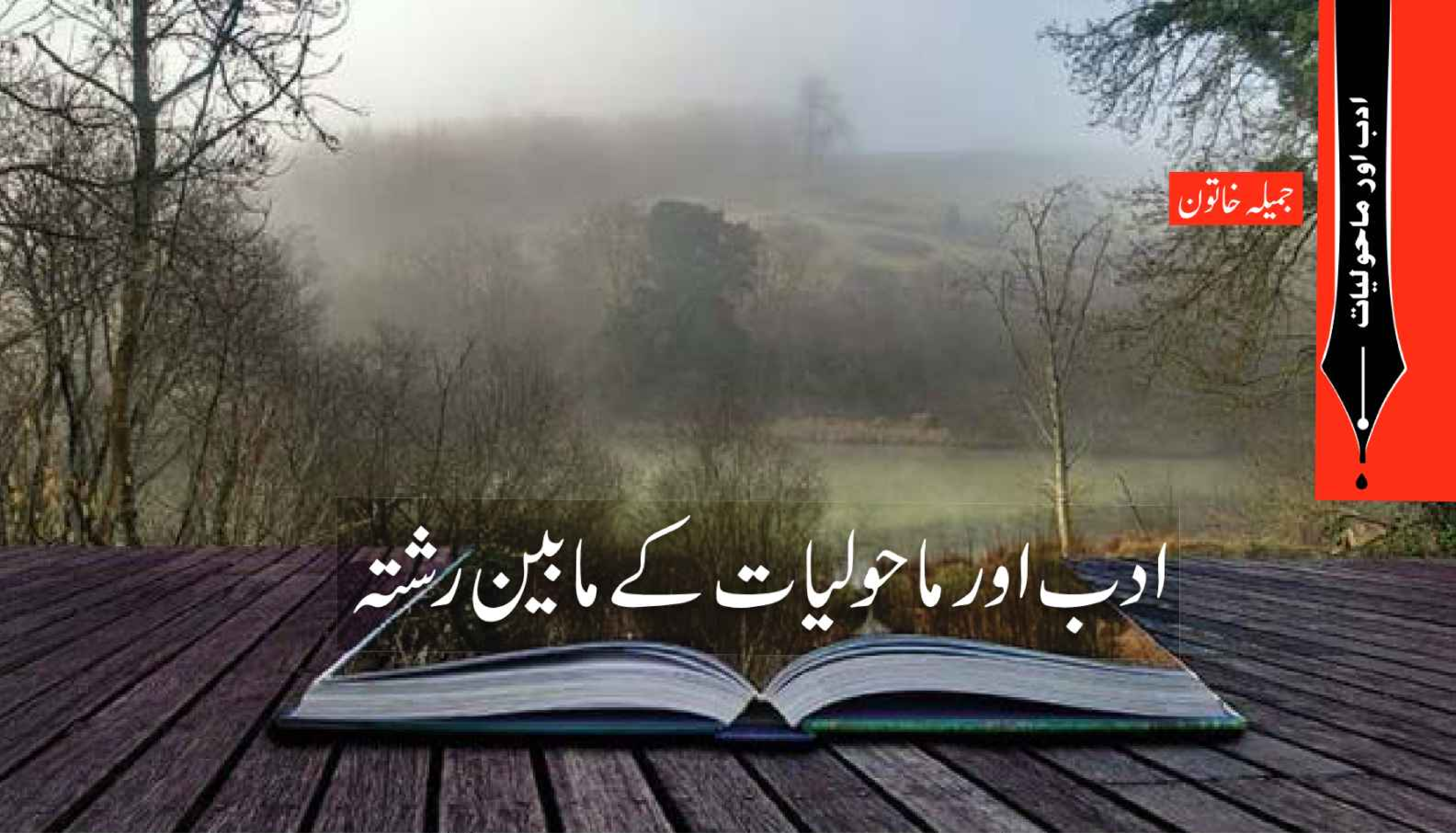

جمیلہ خاتون

ادب اور ماحولیات کے مابین رشتہ

ادب کا شمار فنون لطیفہ کے اعلیٰ مدارج میں ہوتا ہے۔فنونِ لطیفہ تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کی مہذب اور مودّب ترسیل کا فن ہے۔فنون لطیفہ کی اہمیت و افادیت اور اس کی قدر و قیمت کا تعین اس کے دائرۂ اثر کی وسعت پر منحصر ہے۔کسی فردِ واحد کی طبیعت کو لطافت سے آشنا کرنا ادب کا نہ تو وظیفہ ہے اور نہ ہی فریضہ۔ وہی ادب فنون لطیفہ کی شناخت کا حامل ہوتا ہے جس کے حلقۂ اثر میں اجتماعیت کا پہلو غالب ہو اور جو بلا تفریق خاص و عام تمام بنی نوعِ آدم کے لیے کشش و جاذبیت کا سامان فراہم کرے۔

اردو غزل موضوعاتی اعتبار سے شاعر کے حقیقی اور مجازی عشق سے مخصوص دکھائی دیتی ہے لیکن غزل کا یہ عاشقانہ ماحول سامع اور قاری کی طبیعت پر اثر انداز ہوتا ہے۔اکثر کامیاب غزل کے اشعار قاری اور سامع کو اپنے قلبی ماحول کا منظر نامہ معلوم ہوتے ہیں۔فن پارے کی تخلیق ہر چند داخلی طور پر یعنی انفرادی ماحول میں پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اور اس میں تخلیق کار کے جذباتی و احساساتی ماحول بنیادی محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم فنکار کا تخلیقی طریقۂ کار سائنسی اصولوں سے متصادم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کم تخلیقی ماحول سے گزرنے کے بعد جب ادب فنی پیرائے میں ظہور کرتا ہے تو اجتماعی ماحول کو متاثر کرتا ہے۔تخلیق ادب سے لے کر ظہور ادب تک ماحولیات سے ادب کا مسلسل سروکار رہتا ہے۔ ماحولیات کے اثرات ادب کے تخلیقی دورانیے میں ادیب کو شعوری یا لاشعوری طور پر متاثر کرتے ہیں۔ادب ماحولیات اور سماج ہمیشہ باہمی طور پر ایک دوسرے سے منسلک رہتے ہیں۔ ادبی نکات تمدن و ثقافت کی مہذبانہ تشکیل کرتے ہیں۔زمین کے نشیب و فراز اور گرم و سرد ہوائیں ماحولیات کے سرچشمے ہیں اور انہی سرچشموں پر تمدن و ثقافت کی سیرابی کا انحصار ہے۔

انسانی زندگی پر ماحول کی اثر اندازی ایک زندہ صداقت ہے۔ ادبا اور شعرا بھی بنیادی طور پر انسان ہی ہوتے ہیں اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے وہ بھی متاثر ہوتے ہیں بلکہ دیگر عام انسانوں کی بہ نسبت ادبا و شعرا اپنی حساس مزاجی کے باعث ماحول کا ادراک اور احساس قدرے زیادہ رکھتے ہیں۔کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے پیش نظر طبعی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور ماحولیات کے مابین ہمیشہ تعلق برقرار رہتا ہے۔اس تعلق کی نوعیت اکثر و بیشتر جذباتی و حسیاتی نوع کی حامل ہوتی ہے۔ادب بنیادی طور پر جذبات نگاری کا فن ہے۔ ادبی فن پارے جذبات کو انگیز کرتے ہیں اسی لیے ادب میں ماحولیاتی اذکار بھی جذباتیت کے پردے میں ہی ظہور کرتے ہیں۔

ادب، سماج اور ماحولیات ایک دوسرے سے فطری انسلاک رکھنے کے باعث ہمیشہ شانہ بشانہ رہتے ہیں۔ ماحول کا اثر سماج پر پڑتا ہے اور اکثر سماج بھی ماحول پر منفی و مثبت نقوش مرتب کرتا ہے۔ دراصل سماج ماحولیات کا لوازمہ ہے۔ یہاں ماحولیات سے مراد صرف تہذیبی و ثقافتی ماحول نہیں ہے بلکہ سائنسی علوم میں ماحولیات کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بھی صادق آتی ہے۔ سائنس کا ایک حیاتیاتی نظریہ ہے 'حیات از حیات' (Biogenesis) بنیادی طور پر یہ سائنسی نظریہ حیاتیاتی نظام پر مبنی ہے۔ اس نظریے کے مطابق زندگی ہی سے زندگی پیدا کی جاسکتی ہے۔ جامع اردو انسائیکلو پیڈیا کے مطابق:

''ادب، سماج اور ماحولیات ایک دوسرے سے فطری انسلاک رکھنے کے باعث ہمیشہ شانہ بشانہ رہتے ہیں۔ ماحول کا اثر سماج پر پڑتا ہے اور اکثر سماج بھی ماحول پر منفی و مثبت نقوش مرتب کرتا ہے۔ دراصل سماج ماحولیات کا لوازمہ ہے۔ یہاں ماحولیات سے مراد صرف تہذیبی و ثقافتی ماحول نہیں ہے بلکہ سائنسی علوم میں ماحولیات کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بھی صادق آتی ہے۔''

> ''حیات از حیات (Biogenesis): اس نظریے کی رو سے اجسام کی پیدائش پہلے سے موجود ذی حیات اجسام ہی سے ہوسکتی ہے نہ کہ از سرنو غیر ذی حیات مادے سے۔''
>
> (جامع انسائیکلو پیڈیا، جلد 6، قومی اردو کونسل، نئی دہلی، ص 203)

مذکورہ حیاتیاتی نظریہ (Biogenesis) کی وسعت تمام حیاتیاتی نظام تک دراز ہے۔ زمین پر موجود حیاتیاتی نظام میں انسانی زندگی بھی اس نظریے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ انسانی جسم ہی سے انسانی جسم کی تخلیق ممکن ہے۔ خواہ یہ حیاتیاتی عمل شکم مادر میں انجام پذیر ہو یا بذریعہ 'کلون' کسی لیبارٹری میں۔ یہاں یہ بھی ماحولیاتی نکتہ ملحوظ نظر رکھنا ہوگا کہ تمام انسانوں کا حیاتیاتی اصول یکساں ہے۔ انسانی حیاتیاتی نظام کے لیے اگر فضائی آلودگی مہلک ہے تو یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لیے مہلک ثابت ہوگی۔ نظام تنفّس سے لے کر غذا تک اور غذا سے لے کر ماحول تک سارا نظام زندگی تمام بنی نوع بشر کے لیے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ انسانی نظام زندگی کو خوشگوار بنانے میں ہوا، مٹی اور پانی کے علاوہ بھی بہت سارے ماحولیاتی عوامل کارفرما رہتے ہیں۔ احساسات، خیالات اور جذبات بھی انسانی نظامِ زندگی کو متاثر کرتے ہیں لیکن احساسات، خیالات اور جذبات پر طبعی ماحول بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح ماحولیات کا ایک چکر زندگی کے اطرف گردش کرتا رہتا ہے۔

ادب میں ماحول کی داخلی کیفیت کی جلوہ آرائی بکثرت ہوتی ہے۔ جذبات، احساسات، تخیلات اور تفکرات سے ادبی تخلیقات کا تانہ بانہ تیار ہوتا ہے۔ اسی لیے ادب براہِ راست انسانی ضمیر کو اپیل کرتا ہے۔ حیاتیاتی نظریے (Biogenesis) کی رو سے انسان کا انسان کے ساتھ اپنی حیاتیاتی نوع کے اعتبار سے ایک جنسیاتی رشتہ ہوتا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کا دوست اور دشمن بناتا ہے، ایک دوسرے کی خوشی اور غم کا احساس کرواتا ہے۔ اسی لیے اکثر غم کے مواقع پر یہ منظر بھی نظر نواز ہوتا ہے کہ کسی غم زدہ انسان کو روتا ہوا دیکھ کر دوسرا زندہ ضمیر انسان بھی مغموم ہوجاتا ہے۔ ناصر کاظمی کا ایک مشہور شعر ؎

دل تو میرا اداس ہے ناصر　　شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

ناصر کاظمی کے مذکورہ شعر میں اسی کیفیت و ماحول کا اظہار ہے لیکن مضمون جداگانہ ہے۔ مذکور شعر میں شاعر بذات خود اداس ہے اور اداسی کے زیر اثر اسے شہر کا ماحول بے رونق معلوم ہورہا ہے۔ یہ انسان کے داخلی ماحول کا خارجی عناصر (ماحول) پر اثر ہے حالانکہ شہر ویسا ہی ہے۔ لیکن داخلی اضطراب کے ماحول کے باعث اس کی چمک دمک نظروں سے اوجھل ہورہی ہے۔ مرزا غالب نے بھی اس ماحول کو نظم کیا ہے ؎

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

''ادب میں ماحول کی داخلی کیفیت کی جلوہ آرائی بکثرت ہوتی ہے۔جذبات، احساسات، تخیلات اور تفکرات سے ادبی تخلیقات کا تانہ بانہ تیار ہوتا ہے۔ اسی لیے ادب براہِ راست انسانی ضمیر کو اپیل کرتا ہے۔ حیاتیاتی نظریے (Biogenesis) کی رو سے انسان کا انسان کے ساتھ اپنی حیاتیاتی نوع کے اعتبار سے ایک جنسیاتی رشتہ ہوتا ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے کا دوست اور دشمن بناتا ہے، ایک دوسرے کی خوشی اور غم کا احساس کرواتا ہے۔ اسی لیے اکثر غم کے مواقع پر یہ منظر بھی نظرنواز ہوتا ہے کہ کسی غم زدہ انسان کو روتا ہوا دیکھ کر دوسرا زندہ ضمیر انسان بھی مغموم ہوجاتا ہے۔''

غالب کے مذکورہ شعر میں اسی جینیاتی رشتے کی صدائے بازگشت ہے جس کی رو سے ایک انسان دوسرے انسان کے دکھ درد کا شریک بن جاتا ہے۔ انسانوں کی ایک دوسرے کے ساتھ یہ جینیاتی شرکت ہی اسے ایک دوسرے کا ساتھی اور ہم سفر بناتی ہے۔ عہد قدیم میں دنیا کے عظیم فلسفیوں، شاعروں اور ادیبوں کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ ان کے افکار و خیالات دنیا کے محکوم و پسماندہ سماج کو منقلب کرنے پر قادر تھے۔ کوئی بھی فلسفی، شاعر یا ادیب سماج پر اس لیے اپنے نقوش مرتب کرنے میں کامیاب ہوتا ہے کہ سماج کا اس کی ذات سے جینیاتی یا ماحولیاتی رشتہ ہوتا ہے اور اس ماحولیاتی رشتے کو انگیز کرنے پر شاعر یا ادیب جس قدر قادر ہوگا، اسی تناسب سے اس کی شاعری یا ادب سماج پر اپنا تاثر قائم کرتے ہیں۔ دراصل ادب ماحولیاتی رشتے سے مشروط ہے۔

لفظ سائنس اپنے وسیع تر اصطلاحی معنی میں ماحولیاتی سائنس کا بھی نقیب و ترجمان ہے۔ مشاہدے اور تجربات کی بنیاد پر جو سائنسی عمل انجام پذیر ہوتا ہے۔ دراصل وہ ماحولیاتی عمل (تجربہ) ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کوئی نیا ماحولیاتی عنصر (مادہ) ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ادب اسی ماحولیاتی کشاکش کو دل پذیر انداز میں پیش کرتا ہے۔ مجتبیٰ انجم نے ایک ہی جملے میں کامیابی کے ساتھ ادب اور سائنس کے رشتے کو بیان کیا ہے:

> ''ادب سائنس کو مخصوص راہ دکھاتا ہے جب کہ سائنس ادب کو معلوماتی غذا فراہم کرتی ہے۔''

(ماہنامہ اردو دنیا، جون 2015، ص 29)

بظاہر صرف تخلیق ادب کے طریقۂ کار میں سائنسی طرزِ عمل کی کارفرمائی ہے۔ 'گاروے' اور 'ایبلسن' کے نظریات ادبی شہ پارے کی تخلیق کو ایک سائنسی عمل گردانتے ہیں حالانکہ ادب اور ماحولیاتی سائنس کے مابین رشتے داری اس سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ ماحولیاتی سائنس میں فطرت کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ادب اور سائنس کے میدان میں عقل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، جس طرح سائنسی علوم عقل کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی طرح ادب میں بھی تخیلاتی ماحول کی افزائش عقل کی ہی روشنی میں ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دنیا کے تمام علوم وفنون کا مرکز و محور انسانی زندگی ہے۔ قدیم ادوار میں رائج انسانی مسائل اس دور کے اہل ادب کا ہدف تھے۔ انسانی زندگی کو درپیش معاصر خطرات عصری ادب کے موضوعات ہیں۔ گذشتہ چند دہائیوں کے دوران کرۂ ارض کا ماحول بے تحاشہ منفی تغیر و تبدل کا شکار ہوا ہے۔ قدرتی وسائل و ذخائر کے عظیم پیمانے پر غلط استعمال نے کائنات کے حیاتیاتی نظام کو تباہی کے دہانے پر پہنچادیا ہے۔ ماحولیاتی تنزلی کے ضرر رساں اثرات عام انسانی زندگی پر نمایاں ہیں۔ عہد حاضر میں انسانی زندگی کے لیے مہلک ترین خطرہ ماحولیاتی نظام کی زوال آمادگی ہے۔ خوش گوار ماحول ہی سے خوش گوار زندگی مشروط ہے۔ اس کے برعکس مسموم ماحول انسانی زندگی کے لیے زہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے شعر و ادب کا اہم موضوع ماحولیاتی مضامین قرار پا رہے ہیں۔ ماحول کی پراگندگی کے احساس نے ہر زندہ ضمیر اور باشعور اہل قلم کو ماحولیاتی ادب کی جانب متوجہ کیا ہے۔

پچھلی صدی کے آخری عشروں میں مطالعۂ کائنات کا نیا تصور پیدا ہوا۔فطرت کو سائنس کے اصولوں کی میزان پر جانچا گیا۔اس علمی ارتقا نے قدیم ماحولیاتی نظریات کی بت شکنی کی۔نتیجتاً دنیائے ادب بھی اس سے متاثر ہوئی۔ ماحولیاتی موضوعات و مضامین کی اثر پذیری سے دنیائے ادب میں انقلابی اقدامات اٹھائے گئے۔اس طرح ماحولیاتی تنقید(Eco-criticism) کی تحریک شروع ہوئی۔ ماحولیاتی متن سے آراستہ ادبی شہ پاروں میں فطرت کی نمائندگی بجائے مافوق الفطرت انداز بیان کے سائنسی اصول وضوابط کے ساتھ ہونے لگی۔ ماحولیاتی ادب یا ماحولیاتی تنقید(Eco-criticism) ادبی شہ پاروں میں فطرت کی نمائندگی اور ادب و ماحول کے مابین ازلی تعلقات کے دانشمندانہ اور سنجیدہ مطالعے کو کہتے ہیں۔آج عالمی سطح پر ادب اور ماحولیات کے رشتے پر تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔موضوعاتی سطح پر ماحولیاتی اذکار و افکار معاصر ادبیاتی وشعری رجحان میں نمایاں مقام حاصل کر رہے ہیں۔

ماحولیاتی تنقید، ادب اور ماحولیات کا مشترکہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا ہے۔ جہاں ادب کے محققین ایسے متن کا تجزیہ کرتے ہیں جو ماحولیاتی خدشات کو واضح کرتے ہیں اور ان مختلف طریقوں کا جائزہ لیتے ہیں جن سے ادب، فطرت کے موضوع کے انداز اور اطوار مقررہ کرتے ہیں۔

سب سے پہلے جوزف میکر (Joseph Meeker) نے اپنی کتاب "The Comedy of Survival : Studies in Literary Ecology" (1972) میں 'ادبی ماحولیات' کے نام سے ایک خیال کے طور پر اس کی ابتدا کی تھی۔'ماحولیاتی تنقید' کی اصطلاح 1978 میں ولیم ریوکرٹ(William Rueckert) نے اپنے مضمون 'ادب اور ماحولیات: ماحولیات میں ایک تجربہ' میں وضع کی تھی۔

یہ ماحولیاتی مسائل اور فطرت کے تناظر میں مصنفین، محققین اور شاعروں کے کاموں کا تجزیہ کر کے ایک مشترکہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے۔ چند ماحولیاتی نقاد عصری ماحولیاتی صورت حال کی اصلاح کے لیے ممکنہ حل پر غور فکر کرتے ہیں۔حالانکہ تمام ماحولیاتی نقاد ماحولیات کے مقصد، طریقۂ کار یا دائرۂ کار پر متفق نہیں ہیں۔

ماحولیاتی تنقید ایک وسیع موضوع ہے جو حیاتیاتی سیاسیات (Bio Politics)ماحولیاتی تاریخ(Bio History)، ماحولیات اور سماجی ماحولیات کے مابین معلومات فراہم کر کے آگاہ کرتی ہے۔ تنقید کی دیگر ساختوں کے مقابلے میں، ماحولیات کے اخلاقی اور فلسفیانہ مقاصد کے متعلق نسبتاً کم تنازعہ ہوا ہے۔حالانکہ اس کا دائرہ فطرت کی تحریر، رومانوی شاعری اور روایتی ادب سے فلم، ٹیلی ویژن، تھیٹر، جانوروں کی کہانیاں، فن تعمیر، سائنسی بیانیے اور ادبی متن غیر معمولی حد تک متعین ہے۔ماحولیاتی تنقید نے ادبی، سماجی اور سائنسی مطالعہ کے دیگر شعبوں سے آزادانہ طور پر طریقۂ کار اور نظریاتی طور پر باخبر نقطۂ نظر مستعار لیے ہیں۔چیرل گلوٹ فیلٹی(Cheryll Glotfelty) کے مطابق تعریف یوں ہے :''ماحولیاتی تنقید ادب اور طبعی ماحول کے درمیان تعلق کا مطالعہ ہے۔''

لارنس بوئل(Lawrence Buell)نے 'ماحولیاتی تنقید' کی تعریف یوں کی ہے''ادب اور ماحولیات کے درمیان تعلق کا مطالعہ جو ماحولیات کے عمل سے وابستگی کے جذبے سے کیا جاتا ہے۔''

سائمن ایسٹوک(Siman Estok, 2011) نے استدلال کیا کہ ماحولیاتی تنقید صرف ادب میں فطرت یا قدرتی چیزوں کے مطالعہ سے زیادہ ہے، بلکہ یہ کوئی بھی نظریہ ہے جو فکشن کا تجزیہ کر کے تبدیلی کو متاثر کرنے کے لیے پرعزم ہے۔یہ ماحولیاتی تنقید کی ثقافتی ایکولوجی (Ecology)شاخ کے عملی نقطۂ نظر کی بازگشت کرتا ہے، جو ماحولیاتی نظام اور تخیلاتی متن کے درمیان مشابہت کا تجزیہ کرتا ہے اور یہ موقف پیش کرتا ہے کہ اس طرح کی تحریریں ثقافتی نظام میں ممکنہ طور ایک ماحولیاتی فعل رکھتی ہیں۔

انسانی حیات و کائنات سے وابستہ ہر موضوع ادب کا عنوان ہے۔جنگوں کی ہولناکیاں، سرمایہ داروں کی ناانصافیاں، مذہبی ٹھیکیداروں کی تنگ نظریاں، سیاست کی کرشمہ سازیاں، طبقاتی نظام کے مظالم، رنگ ونسل کا امتیاز الغرض کہ ہر وہ موضوع جو انسانی

زندگی سے تعلق رکھتا ہے دنیائے ادب کا پسندیدہ عنوان ہے۔ ماحولیات انسانی زندگی سے وابستہ ایک بے حد اہم سائنسی علم ہے۔ یہ سائنسی علم بھی دیگر ادبی موضوعات کی طرح بحیثیت ادبی موضوع دنیائے ادب میں داخل ہوچکا ہے۔ عہد حاضر میں ماحولیاتی ادب باقاعدہ اپنے سائنسی تقاضوں کے ساتھ داخل نصاب ہوچکا ہے لیکن ادب اور سائنس میں کچھ عمومی فرق بھی ہے۔ اس لیے ادب سے یہ توقع کرنا کہ وہ سائنس کی طرح ماحولیاتی عنوانات کی تشریح و توجیہ کرے ایک ناقص سوچ ہے۔ ادب اور سائنس کا طرز اظہار مختلف ہے۔ سائنس کا مطمح نظر اس کے طرز اظہار کے سبب دماغ کو اپیل کرتا ہے جب کہ ادبی پیرایۂ اظہار دماغ کے ساتھ ساتھ دل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اپنے اسی وصف کے باعث ادبی پیرایۂ اظہار ترسیل وفکر اور ابلاغ شعور کے معاملے میں بے حد کارگر ثابت ہوتا ہے۔

اردو میں ماحولیاتی سائنس کے موضوع پر تحقیقی و تنقیدی مضمون نگاری کا سلسلہ زوروں پر ہے۔ بیشتر مضامین علمی اعتبار سے جامع اور کارآمد بھی ہوتے ہیں لیکن اپنے اندازِ نگارش کے باعث وہ ادب کے بجائے شعبۂ سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماحولیاتی سائنس پر مبنی مضامین اسی صورت ادبی سرمایہ قرار پاسکتے ہیں، جب وہ کسی ادبی صنف کا قالب اختیار کریں۔ انشائیے، فکاھیے، ناول، افسانہ، کہانی یا پھر ادبی اصول تحقیق و تنقید کے پیرائے میں ظہور کرنے والی ماحولیاتی تحریریں ہی ادب کی شناخت کی حامل ہوسکتی ہیں۔ نثر کے برعکس منظومات میں یہ مسئلہ نہیں ہوتا کیونکہ منظوم کلام بہرحال ادبیت کی شناخت رکھتا ہے۔

نگاری کا سلسلہ زوروں پر ہے۔ بیشتر مضامین علمی اعتبار سے جامع اور کارآمد بھی ہوتے ہیں لیکن اپنے اندازِ نگارش کے باعث وہ ادب کے بجائے شعبۂ سائنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماحولیاتی سائنس پر مبنی مضامین اسی صورت ادبی سرمایہ قرار پاسکتے ہیں، جب وہ کسی ادبی صنف کا قالب اختیار کریں۔ انشائیے، فکاھیے، ناول، افسانہ، کہانی یا پھر ادبی اصول تحقیق وتنقید کے پیرائے میں ظہور کرنے والی ماحولیاتی تحریریں ہی ادب کی شناخت کی حامل ہوسکتی ہیں۔ نثر کے برعکس منظومات میں یہ مسئلہ نہیں ہوتا کیونکہ منظوم کلام بہرحال ادبیت کی شناخت رکھتا ہے۔ نظم میں ایک، آلٹریکشن (Altraction) ہوتا ہے، خواہ موضوع غیر متاثر کن ہی کیوں نہ ہو! نظم تکنیکی اعتبار سے کسی نہ کسی حد تک وجدانی کیفیت پیدا کرنے پر قادر ہوتی ہے۔ اس لیے ماحولیاتی عنوانات پر مبنی نظمیں بہ آسانی ادب میں اپنا مقام بنا لیتی ہیں۔ ادب اور ماحولیات کے مابین ہم نے جو رشتہ تلاش کیا ہے وہ ادب کی صنفی تخصیص کے ساتھ ملحق ہے۔ ادب اور ماحولیات کے رشتے کی قدامت کا تعین بھی اسی اصول کے ساتھ ہوگا، جدید ادب ہو یا قدیم ادب، ماحولیاتی اذکار کو کسی نہ کسی صنف میں ہی تلاش کیا جانا چاہیے۔ جب ہم قدیم اصناف ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس دور کے ادب میں ماحولیات کا تذکرہ اسی تناسب سے دکھائی دیتا ہے جس قدر اس دور میں تفہیم ماحولیات کے دریچے کھلے تھے۔ ماحولیات کی تفہیم عہد بہ عہد جس نہج پر رہی ادب سے اس کا رشتہ بھی کم وبیش اسی حد تک رہا۔ جدید دور میں ماحولیات کا عرفان عام ہوچکا ہے لہٰذا ادب سے ماحولیات کی رشتے داری بھی عام ہوتی جارہی ہے۔

□□□

Jameela Khatoon
Research Scholar,RTM Nagpur University Nagpur
H.No.W/260A Near Sufi Nagar Masjid Bhoiline
Kalamna Road
KAMPTEE.441001 (Maharashtra)
Mobile No. 8055195885
Email.jk08june@gmail.com

غزلیں

نازیہ افروز

وہ جو سینے میں آگ تھی، کم ہے
ان دنوں خود سے دوستی کم ہے

مت بسو ان اداس آنکھوں میں
ان جزیروں پہ روشنی کم ہے

ہے فسوں خواب ٹوٹ جانے کا
آج تھوڑی فسردگی کم ہے

سیکھ لینا تھا ہارنے کا ہنر
جیتنے میں اگر خوشی کم ہے

میں نے دوچار ہجر کاٹ لئے
پہلے لگتا تھا زندگی کم ہے

Nazia Afroz
At: Ahmad Ganj, P.O. Bakhadda
Via- S.Kamal (851217)
Distt- Begusarai (Bihar)

رقیہ مظفرپوری

چیخوں سے کانپتا ہے مکمل مرا وجود
جیسے کہ ڈر گیا ہے مکمل مرا وجود

دل چاہتا ہے پوچھ لوں روتے دلوں کا حال
معزور و بے نوا ہے مکمل مرا وجود

انسانیت کا پاٹھ پڑھاتی عدو کو میں
پر مجھ پہ لد گیا ہے مکمل مرا وجود

میری کہانیاں ہوں کہ دنیا کی داستاں
سن سن کے رو رہا ہے مکمل مرا وجود

تم جان ڈالتے کہ مری جاں نکالتے
حالانکہ مر گیا ہے مکمل مرا وجود

مانا کسی کے واسطے کچھ خاص ہو مگر
میرے لیے سزا ہے مکمل مرا وجود

کرتی رقیہ شکر ترا کس زبان سے
بیشک تری عطا ہے مکمل مرا وجود

Rokaiya Khatoon
D/O: Abdul Wahab
Vill- Dharampur Narayan Urf Tehai
Po- Rampur Hari, Ps- Minapur
Dist- Muzaffarpur-843117 (Bihar)

غزلیں

فوزیہ اختر ازکیٰ

دل کی تسکیں کے لیے ہو مرے تدبیر کوئی
پاس تم آ نہ سکو بھیج دو تصویر کوئی

شیریں لہجے سے ہی بھر جاتے ہیں سب زخم مرے
ان کے لفظوں میں ہے مرہم کی سی تاثیر کوئی

مجھ کو پابندِ سلاسل یہ کیے رکھتی ہیں
ان کی یادیں ہیں کہ ان دیکھی سی زنجیر کوئی

ایک ہی وار میں ہر غم کو تہہِ تیغ کروں
کاش آ جائے مرے ہاتھ میں شمشیر کوئی

خواب دیکھے ہیں شبِ وصل کے اکثر میں نے
پر کسی خواب کی ملتی نہیں تعبیر کوئی

دمِ آخر مرے لب پر تھا تبسم رقصاں
اس نے ہاتھوں سے جو لکھ بھیجی تھی تحریر کوئی

وہ بڑی شان سے آ بیٹھے ہیں دل میں ازکیٰ
جیسے یہ دل بھی مرا ان کی ہو جاگیر کوئی

نگاہیں پھیر لینے والوں سے شکوہ نہیں کرتی
پلٹ کر میں بھی پھر ان کو کبھی دیکھا نہیں کرتی

چھپا رکھا ہے اس دل کے نہاں خانے میں مدت سے
عیاں کر کے میں اپنے عشق کو سستا نہیں کرتی

ہمارے دل میں گل چاہت کے اب مرجھائے جاتے ہیں
اور اس کے پیار کی بارش بھی اب برسا نہیں کرتی

محبت کھیل ہے اس کی نظر میں جب سے یہ جانا
کھلونا بننے اس کے پاس میں جایا نہیں کرتی

وہ شر ہو گا سو رب نے اس کو مجھ سے دور کر ڈالا
میں جانے والے کا یہ سوچ کر نوحہ نہیں کرتی

دعا پڑھ کر مری ماں نے مرے سر پر اُڑھائی تھی
اب آندھی میں بھی میری اوڑھنی سرکا نہیں کرتی

کہا اس نے کہ مت کر ترکِ الفت، در گزر کر دے
تو میں نے اعلیٰ ظرفی سے کہا، اچھا، نہیں کرتی

مرے نزدیک رب کی ہے عطا جذبہ محبت کا
سو مَیں اس میں خسارہ فائدہ دیکھا نہیں کرتی

ہمیشہ دل میں رکھتی ہوں خدا کا خوف میں ازکیٰ
تبھی جامِ محبت پی کے بھی بہکا نہیں کرتی

Fauzia Akhter Azka
C/o Md Shahid Iqbal
8B, 1st Floor, Dent Mission Road
Khidderpur, Kolkata-700023(W.B)
fauziapinty786@gmail.com

پرندوں بھری جھیل

سلمی صنم

وہ ایک خوبصورت جھیل تھی جس میں بیشمار پرندے تھے۔ جگمگاتے رنگوں والے، نرم نازک ملائم پروں والے، چہکتے ہوئے، پھدکتے ہوئے، پانی کی سطح پر منڈلاتے ہوئے، آسمان کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے، پانی میں جھکی درختوں کی شاخوں پر بسیرا کرتے ہوئے جانے کس سرزمین سے ہجرت کرکے آئے تھے وہ سارے۔ اور اس کا وہ من پنچھی، چہکتا ہوا، پھدکتا ہوا، اڑتا ہوا اسے ایک نئی زمین کی تلاش تھی۔

شام ہو رہی تھی اور جھیل کے کنارے کھڑے ان پرندوں کی جانب دیکھتے ہوئے آروشی کی سوچ اپنے ماضی کی جانب رینگ گئی۔

اپنے شہر سے بی بی اے کرنے کے بعد وہ ہزاروں میل کا سفر طے کر کے بنگلور آئی تھی جہاں کی ملٹی نیشنل کمپنی میں اسے جوب ملی تھی۔ پہلی ہجرت، خوشی کی اولین بوند، اس کے جسم و جاں میں سرشاری سی پھیل گئی۔ رگ و پے میں سرور سا چھا گیا۔ وہ شہر طلسماتی، ہوشربا۔ اف!! کس قدر وسیع تھا۔ سر بہ فلک عمارتیں، اونچے اونچے مال، دکانیں، شوپنگ کمپلیکس، ہوٹلس، لمبی لمبی سڑکیں، دوڑتی بھاگتی گاڑیاں اور آدمیوں کا ہجوم جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو اس کو لگا جیسے وہ ڈوب جائے گی، تنکے کی طرح بہ جائے گی۔

آفس میں اس کے ساتھ بیشمار لوگ تھے، چہکتے ہوئے، پھدکتے ہوئے، آسمان کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے جانے کہاں کہاں سے ہجرت کر کے آئے تھے وہ سارے۔ وہ ان کے ساتھ ایک ٹیم بنا کر آسمان میں اڑتی رہی، گول گول چکر کاٹتی رہی۔ وہ جوش وہ شوخی، قہقہے، چہچہاہٹ، انوکھا لطف، انجانی لذت، خوبصورت کیفیت اور ایسے میں جب گیتا جیسی خوش مزاج، شوخ و شنگ اور زندہ دل لڑکی سے اس کی دوستی ہوگئی تو زندگی میں جیسے بہار آ گئی۔ اجنبی شہر اپنا بن گیا۔ وہ دونوں خوب گھومتے پھرتے، شوپنگ کرتے، ہر چھوٹے بڑے ریسٹورنٹ کا چکر لگاتے، اسٹریٹ فوڈس پر ہاتھ صاف کرتے، مال سینٹرس میں دھوم مچاتے۔

آفس میں پارٹیاں ہوتیں تو وہ خوب انجوائے کرتی، اپنے مرد دوستوں کے ساتھ ناچتی، گاتی، تھرکتی، مچلتی۔ اس کے تو جینے کا انداز ہی بدل گیا تھا۔

گھر والوں سے موبائل پر جب بھی گفتگو ہوتی تو لگتا ماں واری واری جا رہی ہے، بھائی بہن پروانہ نثار ہو رہے ہیں اور بابا فخریہ کہہ رہے ہیں تو میرا بیٹا ہے اور اس کے من میں کئی راحتیں اتر جاتیں۔ تفاخر کا جذبہ رگ و پے میں سرایت کر جاتا۔ ہر کوئی اسے احساس دلاتا کہ بنگلور شہر کی ملٹی نیشنل کمپنی میں جوب کرنے والی، آسمان اتنی اونچی تنخواہ پانے والی وہ آروشی نہیں ایک ملکہ ہے۔ وہ آؤ بھگت، وہ تعریف

وتوصیف جیسے وہ بہت خاص ہو، یہ نعمتیں، یہ راحتیں یہ آگے بڑھنے کا حوصلہ بڑھاتیں۔ بہت کچھ کر گزرنے کی امنگیں جگاتیں۔ کیا ہوا وہ یہاں اکیلی تھی۔ یہ سارا شہر تو اس کا اپنا تھا۔

یوں خوابوں کے ہنڈولے میں جھولتے ہوئے چھ ماہ کس طرح گزر گئے پتہ ہی نہ چلا۔ یوں وسعتوں بھرے آسمان میں اڑتے اڑتے کسی دن اس کے قدم زمین پر آ لگے تو اس کو یہ دل خراش احساس ہوا کہ وہ اس طرح کی زندگی کے لیے نہیں بنی ہے۔ اس نے تو بہت اونچی اڑان بھری تھی اور اس کے پنکھوں میں اتنی جان ہی نہیں تھی۔ اب وہ یکا تنہا رہ گئی تھی۔ اپنے ارمانوں کی دنیا میں بیگانوں کی طرح۔ اس سرزمین پر ایک اجنبی کی طرح۔ گیتا کے ساتھ وہ گھومنا پھرنا، موج مستی کرنا بھی اب اس کو کثیف، بوجھل اور کھوکھلا محسوس ہونے لگا۔ کام کا بہانا بنا کر وہ گیتا سے بھی کترانے لگی۔ دور ہونے لگی۔ آفس کی پارٹیوں میں بھی اس کے لیے کوئی کشش نہیں رہ گئی۔

اس کے بعد آئے دن کچھ نہ کچھ ہونے لگا۔ وہ ٹوٹنے بکھرنے لگی، ریزہ ریزہ ہونے لگی۔ نامعلوم سمتوں میں اڑنے لگی۔ اس دن بھی جانے کیا ہوا اس کو بخار ہو گیا۔ اجنبی شہر کا موسم بڑا غیر یقینی تھا۔ کبھی بارش ہوتی، کبھی سردی بڑھ جاتی کبھی گرمی

یہ Techie کی زندگی اتنی اسٹریس بھری کیوں ہوتی ہے۔

وہ بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگی، الجھنے لگی، کڑھنے لگی۔

یہ آسمان اتنی اونچی تنخواہ یوں ہی تو نہیں ملتی۔ کام کا اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب دن ختم ہوا اور کب رات ہوئی۔ کبھی تو وہ سیدھی طرح سو بھی نہیں پاتی تھی۔ اس کے کام اور زندگی کے بیچ کوئی توازن نہیں رہا تھا۔ اپنی غذا پر بھی اکثر اس کا دھیان کم ہی رہتا تھا۔ کبھی بریک فاسٹ پر سارا دن چلا لیا کبھی رات کو کھائے بغیر سو گئی۔ بازاری اشیا، جنک فوڈ، نہ دیسی مزا نہ اور کوئی ذائقہ۔ اس کا پیٹ خراب ہونے لگتا تھا۔ ادھر آفس والوں کے چہرے بھی رنگ بدلنے لگے تھے۔ کوئی دوست بن گیا تو کوئی دشمن۔ کوئی قریب آ گیا تو کوئی دور ہو گیا۔ پھر شہر کی ٹرافک جام، لوگوں کا ہجوم وہ بری طرح پھنس جاتی، فریسٹریشن کا شکار ہو جاتی۔ ورک فرام ہوم تو ہوتا تھا مگر جس دن بھی آفس جاتی مارے تھکن کے سونے کی بجائے وہ رات بڑی دیر تک جاگتی رہتی تھی۔ اس کو اکثر بے خوابی کی شکایت بھی رہنے لگی تھی۔

''میرے کام اور زندگی کے بیچ توازن کیوں نہیں؟ اے کاش کوئی ہوتا جو میری دیکھ بھال کرتا'' اس کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ سوچیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں اس کی آفس کا دوست امریش اس کی عیادت کو آیا تو اس کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ کوئی تو تھا جس کو پرواہ تھی۔ وہ جلد ہی ٹھیک ہو گئی۔ مگر امریش اس کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگا۔ مانا کہ وہ ایک اچھا لڑکا تھا مگر وہ کسی ریلیشن کی قائل نہ تھی۔ وہاں پیار کرنے کی فرصت کس کو تھی اور امریش اس سے کیا چاہتا ہے اس کو پتہ تھا۔ مگر اس کے سنسکار اس کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔''

''میرے کام اور زندگی کے بیچ توازن کیوں نہیں؟ اے کاش کوئی ہوتا جو میری دیکھ بھال کرتا'' اس کے خیالات بھٹک رہے تھے۔ سوچیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ خود کو بڑا تنہا محسوس کر رہی تھی۔ ایسے میں اس کی آفس کا دوست امریش اس کی عیادت کو آیا تو اس کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ کوئی تو تھا جس کو پرواہ تھی۔ وہ جلد ہی ٹھیک ہو گئی۔ مگر امریش اس کے قریب آنے کی کوشش کرنے لگا۔ مانا کہ وہ ایک اچھا لڑکا تھا مگر وہ کسی ریلیشن کی قائل نہ تھی۔ وہاں پیار کرنے کی فرصت کس کو تھی اور امریش اس سے کیا چاہتا ہے اس کو پتہ تھا۔ مگر اس کے سنسکار اس کو اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

وہ کام میں خود کو بہت زیادہ مصروف رکھنے لگی تھی مگر کبھی کبھی تنہائی کا احساس اتنا جان لیوا ہو جاتا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ

کیا کرے؟۔اداس، اکیلی، عجیب سی کیفیات میں مبتلا اس کو ہزاروں میل دور بسا اپنا شہر یاد آتا، پرندوں بھری جھیل یاد آتی، گھر والے یاد آتے اور اس کا جی بہت چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، دوڑ کر اپنے شہر چلی جائے مگر جب بھی اپنی ذمے داری کا احساس ہوتا وہ ٹوٹنے بکھرنے لگتی۔ والدین، بھائی بہن سب کے ارمانوں کا وہ مرکز تھی۔ سب کی کفیل تھی۔ وہ کس طرح ان سب کو بیچ راستے میں چھوڑ دیتی۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ جو سارے پرندے ہجرت کر کے آئے تھے وہ سب اندر ہی اندر پھڑ پھڑا رہے ہیں، جھٹپٹا رہے ہیں۔ وہاں ہر کوئی انتشار میں مبتلا تھا۔ اس کی آفس میں ایسے کئی لوگ تھے جو نفسیاتی مسائل کا شکار تھے اور NIMHANS کے چکر کاٹ رہے تھے۔ یہ لوگ وہ تھے جو اپنی مصروفیت کی وجہ سے اپنی فیملی کو وقت نہیں دے پاتے تھے۔ ازدواجی اختلافات، ذہنی الجھنیں، ڈپریشن، مایوسی، فریسٹریشن جانے کن کن جذبوں کے تحت وہ سب جی رہے تھے۔ کسی کو کچھ شکایت تھی تو کسی کو کچھ۔ ان میں سے ہر ایک کو کانسلنگ کی ضرورت تھی۔ اور آفس میں جلد ہی کانسلنگ سروس کا آغاز ہونے والا تھا۔ ایسے میں اس نے گیتا کو بھی یونہی ٹوٹتے بھرتے دیکھا تو وہ بہت زیادہ افسردہ ہوگئی۔

”میں اب اور نہیں سہ سکتی" وہ ڈپریشن کا شکار تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ وویک خود تو دوسری لڑکیوں سے فلرٹ کرتا تھا اور اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کاش وہ اپنی دوست کے لیے کچھ کر سکتی۔ وہ ہاتھ مل کر رہ جاتی

وہ اپنے کام کے تئیں بہت سنجیدہ تھی بہت محنت کرتی تھی۔ مگر آئی ٹی کلچر میں کوئی مروت، کوئی رواداری نہ تھی۔ ہر کوئی کیل کانٹے سے لیس ہو کر رہتا تھا کہ کسی طرح سامنے والے پر وحشیانہ حملہ کرے۔ اس کا کوئی پروموشن نہ ہو سکا۔ دو سال ہو گئے وہ جہاں تھی وہیں رہ گئی۔“

”میں اب اور نہیں سہ سکتی" وہ ڈپریشن کا شکار تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ وویک خود تو دوسری لڑکیوں سے فلرٹ کرتا تھا اور اس کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کاش وہ اپنی دوست کے لیے کچھ کر سکتی۔ وہ ہاتھ مل کر رہ جاتی

وہ اپنے کام کے تئیں بہت سنجیدہ تھی بہت محنت کرتی تھی۔ مگر آئی ٹی کلچر میں کوئی مروت، کوئی رواداری نہ تھی۔ ہر کوئی کیل کانٹے سے لیس ہو کر رہتا تھا کہ کسی طرح سامنے والے پر وحشیانہ حملہ کرے۔ اس کا کوئی پروموشن نہ ہو سکا۔ دو سال ہو گئے وہ جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

پھر کسی دن اچانک لیپ ٹاپ پر بیٹھے ہوئے اس کا ہاتھ بری طرح لرزنے لگا۔ وہ بہت پریشان ہوگئی۔ پھر ڈاکٹر، ٹیسٹس، اسکیانس پتہ نہیں اور کیا کچھ۔ رپورٹس سے پتہ چلا کہ اس کو پارکنسنس ڈیزیز ہے۔

وہ آسمان کی بلندیوں میں اڑتے ہوئے چکرا کر زمین پر گری اور پھر کبھی اڑ نہ سکی۔

پاس ہی کہیں کوئی پرندہ پھڑ پھڑایا تو وہ اپنے خیالوں کی دنیا سے نکل آئی۔ پرندے اب بھی چہک رہے تھے، پھدک رہے تھے اڑ رہے تھے۔

کیا ہر ہجرت بامراد ہوتی ہے اس نے دکھ سے سوچا۔ یہ پرندے جو ہزاروں میل کا سفر طئے کر کے یہاں آتے ہیں کیا یونہی مکمل، بھرپور اپنے وطن واپس لوٹتے ہیں۔ راستے میں تو ان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی جال، کوئی پھندا، کوئی بیماری کوئی حادثہ اس نے وقت دیکھا تین گھنٹے ہو چکے تھے اب اس کو اپنی دوائیں لینی تھی۔ ورنہ اسے پتہ تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکے گی۔ یہیں جم جائے گی جھیل کے اس پار سورج ڈوب رہا تھا۔

Salma Sanam
C/O Muslim Library
8, Upstairs, Veerapillai Street
Shivajinagar
Bangalore 560001 (K.S)

افسانہ

آمنہ سحر

اک نئی شروعات

''ممی ممی کہاں ہو''؟

احمد کی چلاتی ہوئی آواز اسے کچن میں سنائی دی شاید وہ اپنے کمرے سے انھیں پکار رہا تھا۔

''کہا تھا نا، میں نے، مما کی فیورٹ جگہ کچن ہے وہ یہی مل جائے گی پچھلے 25 سالوں سے میں انھیں یہیں ڈھونڈ لیتا ہوں''۔

احمد اپنی بیوی سنبل کو لیے کچن میں آیا اور طلعت کو دیکھ کر اپنی بیوی سے کہنے لگا تو وہ مسکرا دی۔

''اور تم۔۔۔۔۔تم بھی تو ذرا بھی نہیں بدلے یہی ہے تمھارا ممی ممی چلانا۔ پتا ہے سنبل، اسکول جاتے ہوئے وین والا ہارن پہ ہارن دیے جاتا تھا اور ادھر احمد کا ممی ممی چلانا بند ہی نہیں ہوتا تھا اور اسکول سے آتے ہوئے دروازے سے ہی یہ پکارنے لگ جاتا تھا۔۔۔ ہے کہ نہیں ہے''! احمد کی طرف دیکھتے ہوئے طلعت نے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

تو احمد اور سنبل ہنس پڑے

''بتاؤ کیوں ڈھونڈ رہے تھے مجھے''۔۔۔طلعت نے پوچھا۔

''آفس جا رہا ہوں آپ کو بائے کہنے آیا ہوں اور یہ بھی بتانے کہ اب آپ کو اکیلے پن کی شکایت نہیں ہوگی آپ کی پیاری بہو آپ کا ساتھ دے گی''۔

''کیوں؟ سنبل آفس نہیں جا رہی ہے کیا؟'' طلعت نے پوچھا۔

''سنبل نے ریزائن کر دیا ہے'' احمد کے بتانے پر طلعت چونک پڑی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی وہ کہہ اٹھا:

''کیوں کب کیسے؟ یہ آپ اپنی بہو سے پوچھیے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جا رہا ہوں او کے بائے۔''

احمد چلا گیا اور وہ دونوں اپنے اپنے چائے کے کپ لے کر بالکنی میں آگئیں۔

سردیوں کی نرم گرم دھوپ تھی جو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

''آؤ ادھر بیٹھ جاؤ، سردیاں ہیں اس لیے بیٹھ سکتے ہیں، ورنہ گرمیوں میں تو یہ تپنے لگتی ہے۔ اب بتاؤ جاب کیوں چھوڑ دی؟ کیا ہماری وجہ سے۔۔۔؟ ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہے بیٹا۔ کیا تمھیں احمد نے کچھ کہا ہے؟''

سرخ و سفید بوگن ویلیا کے گملوں کے قریب سنبل کو بٹھاتے ہوئے طلعت نے اس سے پوچھا:

یہی بات احمد نے پوچھی تھی جب اس نے ریزائن کی بات کی تھی بلکہ وہ تو ناراض ہونے لگا تھا کہ میں تمھیں ایسا لگتا ہوں کہ تم پر

پابندی لگاؤں گا اور اس نے جواب دیا تھا۔

(بات یہ تھی کہ دونوں کی یہ لو+ ارینج میرج تھی۔ ایک ہی کارپوریٹ سیکٹر میں وہ کام کرتے تھے۔ سنبل نے ابھی اپنی جاب اسٹارٹ کی تھی اور احمد سوپچ کر کے آیا تھا۔ پہلے سلام دعا پھر بات ہونے لگی تو دونوں کو لگا کمپٹیبلٹی بہت ہے۔ زندگی اچھی گزر سکتی ہے اور اچھی بات یہ کہ بنا کسی رکاوٹ کے شادی بھی ہوگئی)

اور اس نے جواب دیا تھا

''احمد یہ میری مرضی ہے جاب تو میں کرتے آئی ہوں اور کروں گی بھی مگر یہ شروع کا وقت اپنے گھر کو دینا چاہتی ہوں۔ تمھارے ساتھ ممی پاپا کے ساتھ وقت گزرنا چاہتی ہوں، اچھا اچھا پکا کے کھلانا چاہتی ہوں اور شام جب تم واپس آؤ میں سجی سنوری تمھیں ویلکم کرنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے کہ جب بنیاد مضبوط ہوتی ہے تو گھر جلدی نہیں ٹوٹا کرتے اس لیے میں اپنی مضبوط بنیاد بنانا چاہتی ہوں۔''

''اچھا یہ بات ہے''۔۔۔ وہ ہنس پڑا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ''سوچ لو پھر بھی بعد میں مجھے کچھ مت کہنا''۔

''سوچ لیا ہے'' اس کے اس لہجے پر وہ خاموش ہوگیا۔

یہی جواب اس نے ممی کو بھی دیا'' ارے نہیں ممی یہ میری مرضی تھی کہ میں ریزائن کردوں۔ احمد کی طرف سے کوئی پریشر نہیں بس سمجھ لیجیے میری خواہش ہے کہ میں بریک لینا چاہتی ہوں کچھ وقت خود کو اور اپنے گھر کو دینا چاہتی ہوں جاب تو ہوتی رہے گی''

''چلو جیسی تمھاری مرضی''۔ طلعت نے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا

وہ خاموشی سے چائے پیتے رہے پھر سنبل نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور کہا:

''اپنے بارے میں بتایئے ممی۔ اپنی لائف کے بارے میں''۔

''کیا بتاؤں بیٹا کوئی خاص بات ہے ہی نہیں، وہی عام سی زندگی، تمھیں پتہ تو ہے احمد کے ابو بینک میں اکاؤنٹنٹ تھے مگر یہ پتہ نہیں ہوگا کہ وہ وقت کے بڑے پابند ہیں۔ پابندی وقت میں نے ان سے ہی سیکھی، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ انھوں نے سکھایا۔ 10 بجے آفس تھا مگر ان کی تیاری آٹھ بجے سے شروع ہوتی تھی۔ کہیں جانا ہو تو وقت پہ تیار ہو جانا ذرا سی دیری ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ شروع شروع میں تو بہت ڈانٹ کھائی پھر رفتہ رفتہ عادت سی ہوگئی۔

(اور یہ تو سنبل بھی جان گئی تھی، شادی کے دن یہ شہر کی پہلی بارات ہوگی جو ٹائم پر پہنچ گئی بلکہ سنبل کے چھوٹے بھائی نے تو کہا تھا کہ اس بات پر اسے تاریخ میں محفوظ رکھنا چاہیے کہ سالوں میں پہلی بار کوئی بارات وقت پر پہنچی ہو۔)

''ساس۔۔۔ اللہ رحم کرے بڑی تیز تھیں۔ شروع کے پانچ سال تو جیسے میں نے کانٹوں پر گزارے، ان کو میرا کام پسند آتا تھا نہ خود وہ کام کرنا چاہتی تھی، احمد کے ابو سے کچھ کہوں تو چپ ہو جاتے، پھر کہتے ذرا صبر کرلو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سسر۔۔۔ اللہ جنت دے بڑے نفیس انسان تھے۔ خاموش عبادت گزار، میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے۔ بس ایک شکایت کہ اپنی بیوی کو کبھی روکا ٹوکا نہیں اور جیسے احمد کے ابو نے کہا تھا کہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیک ہوا یا نہیں پتہ نہیں، بلکہ یہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ بچے بڑے ہو گئے اسکول جانے لگے۔ احمد کو پرموشن ہوئی، سو کام بھی بڑھ گیا، پھر زندگی نو سے پانچ کی روٹین پہ چلنے لگی۔ بچوں کا اسکول نو بجے سے شروع ہو جاتا تھا مگر وہی وقت کی پابندی وہ ساڑھے آٹھ تک اسکول پہنچ جاتے۔ احمد تو بہت غصے میں آجاتا تھا اور کہتا تھا کہ اسکول میں داخل ہونے والے وہ پہلے بچے ہوتے ہیں مگر صرف میرے سامنے۔۔ اپنے باپ کے سامنے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور نو بجے وہ تیار۔۔۔ پھر ساس سسر کو ناشتہ دینا گھر کے کام کاج میں دن گزر جاتا، پتہ بھی نہیں چلتا کب دن گزر گیا۔ شام کی چائے ساس کو بڑی مرغوب تھی اور شام کی چائے پر اہتمام اس سے زیادہ محبوب۔۔ وہ خالی چائے نہیں پیتی تھیں اور اکیلے بھی نہیں۔ سارے گھر کو ساتھ دینا ہوتا تھا سو شام کی چائے اور پھر رات کا کھانا اور پھر سو جانا اور دوسرے دن وہی شروعات۔۔۔۔

بس ان ہی دن رات میں زندگی کٹ گئی۔

اپنے سامنے کے پودوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا۔ انداز خود کلامی سا تھا۔

سنبل کو لگا جیسے خود سے باتیں کہہ رہی ہو۔ وہ کیا کہتی چپ رہی۔۔

''تم بھی سوچ رہی ہونا اتنا بڑا جواب دے دیا کیا کروں، یہ سوال کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ زندگی میں شاید تم نے پہلی بار پوچھا تو سب کہہ دیا وہ جو کچھ دل میں تھا''۔۔۔

وہ کچھ جھجکتے ہوئے بولیں تو سنبل نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔۔

''ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔ میں بس یہ سوچ رہی تھی کہ آپ کی اور میری مما کی زندگی کتنی ملتی جلتی ہے۔''

''ہمم۔۔ صحیح ہم عورتوں کی زندگی ایک جیسی ہوتی ہے۔۔'' کہتے ہوئے انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''احمد بتا رہے تھے کہ آپ کو گارڈننگ بہت پسند ہے''سنبل نے بات بدل دی۔

''ہاں پھولوں پودوں سے مجھے عشق تھا۔ پھول تو احمد کے ابو نے لا کر نہیں دیے، تو پودوں پر ہی اکتفا کر لیا۔ یہ ایک واحد شوق تھا جس پر میری ساس ناراض نہیں ہوئیں، ورنہ ان کو تو ہر بات سے شکایت تھی۔۔''

''اچھا چلیے یہ بتائیے کہ سب کو کیا کیا پسند ہے۔ ناشتہ لنچ اور ڈنر میں کیا زیادہ بنتا ہے''؟ اس سے پہلے کہ وہ ماضی میں کھو جاتیں سنبل نے پوچھ لیا۔۔

''ناشتہ تو ہم لوگ سادہ ہی کرتے ہیں، وہی روٹی سبزی۔۔۔ ویک اینڈ اسپیشل ہوتا ہے، کھچڑی قیمہ کبھی اڈلی ڈوسہ اور کبھی نان چھولے، دوپہر میں میں اکیلی ہوتی ہوں اور جب تک ساس ہوتی تھیں تو وہ کہتی تھیں کہ دو عورتیں ہیں۔ کیا بناؤ گی؟ صبح میں زیادہ بنا لینا وہی کھالیں گے یا رات کے بچے ہوئے سالن سے کھالیں گے تو وہی عادت ہوگئی۔ اب کبھی روٹی سے صبح کی سبزی کھالیتی ہوں یا رات کے سالن سے چاول لے لیتی ہوں۔ ہاں رات میں ہمیشہ تازہ بناتی ہوں۔ احمد کے ابو اور بچے سارے گھر پر ہوتے ہیں۔ گوشت کا ایک سالن کوئی ایک سبزی رائتہ، سلاد، روٹی اور چاول۔ احمد کے ابو کو گرم گرم چپاتیاں پسند ہیں، سو ہمیشہ بالکل تازہ بناتی ہوں۔ بچے جب تک دسترخوان بچھاتے ہیں میں روٹی ڈال لیتی ہوں۔ احمد کو مٹر گوبھی بیگن نہیں پسند، سو کچھ بھی بنالوں تو کوشش کرتی ہوں کہ یہ سبزیاں نہیں ڈالوں۔ ساجد (دوسرا بیٹا) اس کو ہرا مصالحہ اچھا نہیں لگتا، اس کے لیے الگ سے نکال کر رکھتی ہوں اور راشد (چھوٹا بیٹا) اس کو صرف زیادہ تیز پسند نہیں۔ اس کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے ورنہ وہ ناراض ہو جاتا ہے۔۔''

اپنے بچوں کی پسند ناپسند کے بارے میں بتاتے ہوئے ان کا چہرہ مما سے کتنا مل رہا تھا۔ وہ بھی تو یہی کہتی تھی تمھیں کریلا نہیں پسند تمھارے لیے قیمہ فرائی کر دیا ہے۔ رمشہ کو پلاؤ میں آلو نہیں پسند، اس کے لیے الگ سے بنا دیا ہے اور تمھارے ابو کو مٹر نہیں پسند، سو اس میں مٹر نہیں ڈالا۔ یہ مائیں ایک جیسی کیوں ہوتی ہیں اس نے سوچا اور مسکرا کر ان سے پوچھا:

''اور آپ کو کیا پسند ہے کیا ناپسند ہے''۔.؟ تو کچھ دیر کے لیے وہ خاموش رہ گئیں۔

''میں سب کھالیتی ہوں''۔۔ پھر مسکراتے ہوئے انھوں نے کہا

''اچھا یہ بتائیے سنڈے کیا بنتا ہے۔''سنبل نے پوچھا۔

''سنڈے۔۔۔۔۔ سنڈے اسپیشل لنچ ہوتا ہے، بریانی تو ہوتی ہے پھر روٹی۔۔۔ روٹی کے ساتھ کبھی مٹن قورما، کبھی چکن فرائی اور ساتھ سبزی کا کوئی سالن بنالیتی ہوں کیونکہ لنچ ایک ہی دن تو سب مل کے کرتے ہیں تو کوشش کرتی ہوں کہ سب کی پسند کا کوئی نہ کوئی ایک سالن تو دسترخوان پر موجود رہے۔ رات کا کھانا بچے باہر کھالیتے ہیں، تو میں احمد کے ابو دوپہر کا ہی کھالیتے ہیں۔۔۔ اب کبھی کبھی بچے لوگ ڈنر کے لیے باہر ہوٹل لے جاتے ہیں تو کہتے ہیں دوپہر میں کچھ بھی نہ بنانا۔۔ اب تم آ گئی ہو تم دیکھ لینا''۔۔۔

''ہمم چلیں دیکھتے ہیں، اب یہ بتائیے آج دوپہر میں کیا پکاؤں''؟سنبل نے بات بدل دی

''دوپہر میں''۔۔۔؟ طلعت استعجابیہ انداز میں بولیں اور کہا:

''صبح کی آلو میتھی تو ہے۔۔ ہم دونوں عورتیں تو ہیں، وہی کھا لیں گے۔ چاول بنالینا اگر تم کو پسند ہو تو، ورنہ میں روٹی ڈال لوں گی''۔

جواب حسب توقع تھا، اس لیے وہ مسکرادی۔

پتہ نہیں ہم سب ایک ہی روپ میں کیوں ڈھل جاتے ہیں۔

جو جواب ان کی ساس نے دیا تھا وہ ساس بن کر وہی جواب دے رہی تھیں، گو کہ کبھی ان کو اس پر اعتراض تھا اور اب ان کو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ وہ خود اپنی ساس جیسی بن رہی تھیں۔

سنبل ان کے قریب ہوئی اور کہنے لگی:

''میں آپ کو ایک اسٹوری سناتی ہوں، میرا انجینئرنگ ہو گیا تھا، جاب کے لیے انٹرویو کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ پہلی بار تھا میں گھر پر تھی ورنہ اسکولز کالجز پھر یونیورسٹی، کبھی گھر پہ رکنے کا موقع ہی نہیں ملا۔میں نے سوچا مما کی ہیلپ کرتی ہوں۔۔ان سے کھانے کا پوچھا تو جو کچھ آپ نے بتایا ہے، انھوں نے بھی وہی کہا۔۔کوئی ان کی خاص پسند نہیں۔۔تم یہ کھاتی ہو، وہ یہ کھاتی ہے۔عبداللہ (بیٹا) یہ نہیں کھاتا وغیرہ وغیرہ۔اور ان کا لنچ وہی دوپہر کی یا رات کی بچی ہوئی سبزی۔کبھی اپنے لیے تازہ نہیں بنایا۔جب ان سے پوچھا کیوں۔۔؟ تو وہی دلیل دی کہ میں اکیلی عورت ہوتی ہوں کیا بناؤں اپنے لیے''....

تو پتا ہے میں نے کیا جواب دیا۔۔سنبل اک ثانیہ کے لیے رکی، پھر طلعت کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑا، دھیرے دھیرے اس کی پشت سہلاتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا۔۔

''کیوں آپ اپنے لیے کیوں نہیں بناتیں آپ سب کے لیے بناتی ہیں..دسترخوان پر سب کی پسند کے سالن ہوتے ہیں، آپ کی پسند کا کیوں نہیں۔۔؟؟ سب کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھتی ہیں مگر اپنا نہیں۔۔؟ ہر دن لنچ پر باسی سبزی کھاتی ہیں۔اور وہی لنچ جب سنڈے میں بنایا جاتا ہے تو پھر سب کی پسند کا اور تازہ بنایا جاتا ہے ایسا کیوں۔۔؟ لنچ میں آپ اکیلے ہوتے ہیں تو اپنے لیے اہتمام کر لیجیے اپنے لیے اپنی پسند کا بنا لیجیے"۔۔

وہ چپ رہ گئیں۔۔تب میں نے سوچا تھا:

''ممی ہم عورتیں ایسی کیوں ہو جاتی ہیں جس رشتے میں بندھتی ہیں اس رشتے کو نبھانے میں اپنے آپ کو بھلا دیتی ہیں۔جب شادی کرتی ہیں بیوی بنتی ہیں تو خود لڑکی ہونا بھول جاتی ہیں۔بیوی کے فرائض ادا کرتے کرتے ایک لڑکی کے ناطے اپنی پسند ناپسند کو بھول جاتی ہیں۔جب ماں بنتی ہیں تو اپنی ذات بھول جاتی ہیں، ماں کی زندگی جیتے جیتے یہ بھول جاتی ہیں کہ وہ بھی ایک انسان ہیں ہم عورتیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔۔؟؟؟

مرد تو ایسا نہیں کرتے وہ شوہر بنے یا باپ، اپنا مرد ہونا کبھی نہیں بھولتے۔اپنے شوق نہیں بھولتے۔پان کھانا ہو، سگریٹ پینا ہو دوستوں کی محفل میں جانا ہو، جم جانا ہو یا ٹی وی پہ گھنٹوں میچیز دیکھنا ہو یا نیوز دیکھتے رہنا ہو یا کوئی اور پروگرام وہ کبھی نہیں بھولتے ہم کیوں بھول جاتے ہیں۔۔؟ اپنی پوری بات کرتے ہوئے سنبل نے طلعت سے پوچھا تو وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہیں کچھ کہا نہیں۔۔

پھر اس کا گال تھپتھپا کر کہا'' باتیں ہی بہت اچھی کرتی ہو یا پکا بھی لیتی ہو''۔۔؟؟

'' آپ کھا کر تو دیکھیں پھر آپ سے سنوں گی، کیسا بناتی ہوں؟ ایک موقع تو دیجیے''۔۔۔۔ ہنستے ہوئے سنبل نے کہا تو طلعت بھی ہنس پڑیں۔

''میرے بچپن میں میری ماں امباڑہ کی چٹنی بہت مزے کی بناتی تھیں، لہسن، بھنی ہوئی ہری مرچ اور شاید تھوڑا سا کھوپرا بھی ہوتا تھا۔مجھے اکثر وہ یاد آتی ہے پتا نہیں تمھیں بنانی آتی ہے یا نہیں''۔۔۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد طلعت نے کہا۔

''ارے یوٹیوب کس کا نام ہے وہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔۔'' سنبل نے ایکسائٹمنٹ سے کہا۔

اور کچھ ہی دیر میں پچیس اور پچاس سال کی دو عورتیں یوٹیوب پر امباڑہ کی چٹنی بنانے کے ویڈیوز دیکھ رہی تھیں۔

❑❑❑

Advocate Amena saher
Flat no. N2,31,Nakshatra apartment,
Sugat colony,Jafar Nagar,
Nagpur, Maharashtra-440031
Mob:9356387183
Mail: advamenafsaher@gmail.com

افسانے

قاضیہ تضمین

حقیقی پردہ

وہ ایک ایسے مسلم متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی جہاں لڑکیوں کی نگہداشت آبگینے کی طرح کی جاتی تھی۔ اس سے بڑی ایک اور بہن تھی، سلمٰی، والد کی شدید خواہش کے باوجود انھیں ایسا کاندھا میسر نہیں ہوا تھا جو بڑھاپے میں ان کا سہارا بن سکے اور آخری سفر میں انھیں کاندھا دے۔ ان کی نگاہ میں بیٹیاں تو خود بوجھ ہوتی ہیں، بوجھ اٹھانے والی نہیں، اس بوجھ کو کسی طرح جلد سے جلد کاندھے سے اتار پھینکا جائے وہی بہتر ہے۔ ان کی موجودگی سے ہر وقت سر پر خدشات کے بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔

اس کی ماں اکثر کہتی تھیں:

''لڑکی کی عزت اُس کے دوپٹے میں ہے اور دوپٹہ اُس کی عقل سے زیادہ لمبا ہونا چاہیے۔''

پہلی بار جب یہ بات اس نے سنی تو وہ صرف نو سال کی تھی۔ اسکول جانے سے پہلے ماں نے اسے نیا اسکول بیگ، پرانی کتابیں اور ایک چیخ نیلا دوپٹہ پکڑا دیا تھا۔ اس نے کہا "ماں، یہ تو میرے قد کے سائز کا نہیں! بہت بڑا ہے انھوں نے تنبیہی لہجے میں کہا تھا۔

''دوپٹے کبھی سائز کے نہیں ہوتے بیٹی، نصیب کے ہوتے ہیں۔''

اور پھر اس کی زندگی کا بڑا حصہ اسی نصیب کے دوپٹے میں الجھا رہا۔

اس کے گھر میں دیواریں کم تھیں، پردے زیادہ۔

اندر بھی پردے، باہر بھی پردہ، کھڑکی پر پردہ، دروازے پر پردہ، باتوں پر پردہ، لڑکیوں کی ہنسی پر پردہ، سوال پر پردہ، آنکھ کی چمک پر پردہ۔

ماں نے سنجیدگی سے کہا ''میری نانی اماں کہتی تھیں:

''پردہ عورت کا زیور ہے۔''

وہ معصومیت سے سوچا کرتی تھی۔

وہ گھر کے گھٹن بھرے ماحول سے فرار چاھتی تھی لیکن کوئی اور جائے پناہ نہیں تھی سوائے اسکول کے۔۔ اس نے پڑھائی میں خود کو غرق کر دیا۔ خدا کی طرف سے ذھانت ودیعت ھوئی تھی۔ اس لیے پڑھنے میں دیگر طلبا وطالبات سے تیز تھی۔ ۔ ھمیشہ کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرتی۔ میٹرک کے بعد اسی اسکول سے پلس ٹو کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو اس کی خوشی کی انتھا نہ رھی، اب اس کا اگلا قدم کالج میں داخلہ لینا تھا ، کالج کے خیال میں ھی ایسی کشش تھی کہ وہ ایک عجیب سی سرور میں مبتلا تھی۔

''مگر زیور تو چمکتا ہے، دِکھتا ہے، یہ پردے تو لڑکیوں کو چھپاتے ہیں۔''

اس کے ابا شبیر احمد ڈاک خانے میں کلرک تھے اور اماں صابرہ خاتون ایک ایسی گھریلو عورت تھیں جن کا مزاج بھی نام جیسا تھا۔ زیادہ تر زبان بند اور آنکھیں کھلی رکھتیں۔ مگر جب بھی بولتیں، آنکھیں جھک جاتیں اور الفاظ کاٹنے لگتے۔

اماں کی باتوں میں اکثر کوئی نہ کوئی چھپی دعا یا ڈھکی بددعا ہوتی تھی۔ جیسے وہ کہا کرتیں:

''اللہ کرے تُو ایسی جگہ بیاہی جائے جہاں ساس ماں جیسی ہو''!

اور وہ سوچا کرتی:

''ساس، ماں جیسی نہ ہو تو کوئی بات نہیں بس میری اماں جیسی نہ ہو۔''

وہ گھر کے گھٹن بھرے ماحول سے فرار چاہتی تھی لیکن کوئی اور جائے پناہ نہیں تھی سوائے اسکول کے۔ اس نے پڑھائی میں خود کو غرق کر دیا۔ خدا کی طرف سے ذہانت ودیعت ہوئی تھی۔ اس لیے پڑھنے میں دیگر طلبا وطالبات سے تیز تھی۔ ہمیشہ کلاس میں اول پوزیشن حاصل کرتی، میٹرک کے بعد اسی اسکول سے پلس ٹو کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اب اس کا اگلا قدم کالج میں داخلہ لینا تھا، کالج کے خیال میں ہی ایسی کشش تھی کہ وہ ایک عجیب سی سرور میں مبتلا تھی لیکن اس وقت اس کی تمام تر ارمانوں پر پانی پھر گیا، جب ابا نے سرد لہجے میں کہا:

''لڑکیوں کو زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، کالج کا ماحول ویسے بھی شریف لڑکیوں کے لائق نہیں۔ اب تمھاری شادی کی کوشش کرنی ہوگی''

صفیہ کے اندر غصے اور بے بسی کا لاوا پھوٹ پڑا۔ اس کی ماں تو ابا کے سامنے زبان ہی نہیں کھولتی تھیں، اس مرتبہ بھی خاموش رہیں، لیکن پہلی بار ان کی آنکھوں میں احتجاج کے رنگ ابھرے، اس کے اندر ایک ایسی لڑکی سانس لیتی تھی جسے کبھی لب کھولنے کی آزادی نہیں ملی، لیکن اس بار اس نے اپنی ہمتوں کو مجتمع کیا اور دھیمے مگر مضبوط لہجے میں ابا سے اختلاف کیا۔

''لڑکی ہونا گناہ ہے کیا جو اسے زیورِ تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کچھ بننا چاہتی ہوں اور مجھے امید تھی کہ آپ اس سلسلے میں میری حوصلہ افزائی کریں گے لیکن ...''

''خاموش رہو۔۔۔ تمھیں فیصلے کرنے کی اجازت کس نے دی''

ابا نے برافروختہ ہو کر اس کی بات قطع کی۔

''اس گھر میں فیصلے کرنے کا اختیار صرف مجھے حاصل ہے۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ آگے پڑھنے کی ضرورت نہیں، جتنی تعلیم حاصل کی، گھریلو ذمہ داری اٹھانے کے لیے بہت ہے''

وہ اپنا حتمی فیصلہ سنا کر چلے گئے تو اس کے اندر بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں، لیکن اس کی ذہنی تربیت اتنے سخت گیر انداز میں کی گئی تھی کہ وہ ان چنگاریوں کو شعلہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اسی دوران صفیہ کی بڑی بہن سلمیٰ آپا جو سخت پردے میں بیاہی گئی تھیں، پردے میں ہی ماردی گئیں۔

شوہر شرابی تھا، ساس لعنتی، نند چھپکلی۔ مگر اماں کہتی تھیں:

''بیٹی کا جنازہ سسرال سے ہی اٹھے تو اچھا رہتا ہے۔

اور ابا چپ چاپ سگرٹ جلاتے، جیسے دھوئیں میں بیٹیوں کا نصیب جلانا ان کی قسمت کا فیصلہ ہو۔

کوئی ایف آئی آر ہوئی اور نہ مقدمہ اور ایک بیرنگ کہانی اپنے زمینی خالق کی بے حسی اور اپنی بے توقیری کا ماتم کرتی ہوئی خاک ہو کر خاک میں چھپ گئی۔

سلمیٰ آپا کی موت کے بعد اماں کچھ اور زیادہ مذہبی ہو گئیں۔ ہر وقت مصلے پر سجدہ ریز رہتیں اور ان گناہوں کی معافی مانگتی رہتیں جو ان سے سرزد بھی نہیں ہوئے تھے۔

کبھی کبھی وہ شکست خوردگی سے کہتیں:

''دنیا بڑی ظالم ہے، بیٹی جتنا چھپ کر رہیں اتنا ہی بہتر ہے''

اس نے کہنا چاہا کہ سلمیٰ آپا تو سات پردوں میں چھپ کر رہیں تو کیا ظالم دنیا نے انھیں چھوڑ دیا، ظلم سے چھپنے سے ظلم کیا رک جاتا ہے۔

اس کے لیے رشتے دیکھے جانے لگے تو اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

”میں سلمیٰ آپا کی طرح حبس زدہ ماحول میں زندہ درگور نہیں ہونا چاہتی، میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہوں۔“

اماں نے پہلی مرتبہ اس کی حمایت کرتے ہوئے ابا سے بولیں:

”اگر یہ آگے پڑھنا چاہتی ہے تو پڑھنے دیں، اس کے ساتھ بھی زبردستی کی گئی تو شاید ہم اسے بھی کھودیں گے۔“

ابا سلمیٰ کی موت اور اپنی بیچارگی سے اندر ہی اندر شاید ٹوٹ سے گئے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے کالج میں داخلے کی اجازت دے دی۔

صفیہ کو کالج جانے کی اجازت ملی تو پردے کے ساتھ شرطیں بھی لپٹی ہوئی آئیں۔

”کوئی مرد استاد ہو تو سوال نہیں پوچھنا۔

لائبریری نہیں جانا۔

فون نہ لینا۔

کلاس کے بعد فوراً گھر آنا“

اس نے کالج جانے کی کشش میں سارے احکامات مان لیے

کالج کا ماحول اس کے لیے بالکل نیا اور دلچسپ تھا لیکن اس نے اس میں خود کو کھونے نہیں دیا، بس اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر مرکوز رکھی۔ اپنی ذہانت اور صلاحیت کی وجہ سے وہ جلد ہی پروفیسروں کی نگاہ میں آ گئی۔ ایک بار معاذ سر نے کلاس کے سبھی طلبا و طالبات کو ایک ادبی موضوع پر مضمون لکھنے کو کہا۔ معاذ سر اس کے پسندیدہ پروفیسر تھے، جوان العمر تھے، لیکن ان کے چہرے سے ہمیشہ سنجیدگی اور متانت جھلکتی رہتی تھی، وہ شعروادب بھی تخلیق کرتے تھے، دنیائے سخن میں ان کا ایک معتبر نام و مقام تھا۔

سبھی کے تحریر کردہ مضامین انھوں نے سرسری طور پر پڑھے لیکن اس کے مضمون کی کاپی پر ان کی نگاہ جم گئی۔ انھوں نے اسے بغور پڑھا اور پھر کاپی پر لکھا نام لے کر آواز دی:

”صفیہ بشیر“!

”لیس سر“! وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی ،انھوں نے اسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا:

”تمھارا مضمون تو بہت جامع اور معیاری ہے کیا تم شعرو ادب لکھتی رہی ہو“

”نہیں سر! مجھے شعروادب سے دلچسپی تو بہت ہے لیکن میں لکھتی نہیں ہوں“

”تمھیں لکھنا چاہیے، خدا نے تمھیں اعلیٰ صلاحیت ودیعت کی ہے تو اس کا اظہار کرو“

”تمھارے اندر تخلیقی جوھر وافر مقدار میں موجود ھے ۔ اس جوھر کو ضائع نہ ھونے دو۔ اپنی پڑھائی کے ساتھ لکھنے پر بھی توجہ دو ۔ تمھارے مستقبل کو روشن کرنے میں کام آئیں گے ۔ اس سلسلے میں تمھیں کوئی مدد کی ضرورت ھو تو مجھے کھنا۔ میں تمھاری رھنمائی کروں گا“

معاذ سر کے یہ تعریفی جملے اس کے ذہن پر چپک گئے، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ معاذ سر کی باتوں پر عمل کرتے ہوئے ادبی دنیا میں قدم رکھے گی۔ اس نے دو تین روز میں پہلا افسانہ تخلیق کیا اور معاذ سر کو دکھا کر ان سے رائے طلب کی انھوں نے افسانہ پڑھنے کے بعد اسے بے حد پسند کیا اور اس کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

”تمھارے اندر تخلیقی جوہر وافر مقدار میں موجود ہے اس جوہر کو ضائع نہ ہونے دو اپنی پڑھائی کے ساتھ لکھنے پر بھی توجہ دو تمھارے مستقبل کو روشن کرنے میں کام آئیں گے۔ اس سلسلے میں تمھیں کوئی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے کہنا۔ میں تمھاری رہنمائی کروں گا۔

تم اگر چاہو تو میں اس افسانے کو کسی اچھے ادبی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیج دوں“

اس نے بخوشی اجازت دے دی اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

اس نے چند اور افسانے لکھے اور ان کے مشورے سے ان کی نوک پلک سنوارے۔ اسی دوران اس کا پہلا افسانہ ایک معتبر

ادبی رسالے میں مدیر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا، اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا کہ اچانک اس پر بجلی گر پڑی، اس کے والدین اس کے مطبوعہ افسانے کو دیکھ کر چراغ پا ہو گئے خصوصاً اس کے ابا تو اس قدر برافروختہ ہوئے کہ انھوں نے اعلان کر دیا:

''اس لڑکی کا کالج جانا آج سے بند اسے تو اپنی عزت و ناموس کا ذرا بھی پاس نہیں۔ یہ ہمارے منہ پر کالک مل دے گی۔ میں جلد سے جلد اس کا رشتہ تلاش کر کے اس مصیبت سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔''

اسے ایک طرح سے گھر میں قید کر دیا گیا اور اس کے رشتے کی تلاش ہونے لگی۔ جلد ہی ایک رشتہ بھی طے پا گیا، کوئی اڈھیر عمر کا مولوی نما شخص تھا جو دوسری شادی کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی پہلی بیوی سے کوئی لڑکا نہیں تھا، تین بیٹیاں ہی بیٹیاں تھیں۔

صفیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اسے ایک جہنم سے نکال کر دوسرے جہنم میں ڈھکیلا جا رہا تھا اور یہ اسے کسی طور گوارا نہیں تھا لیکن وہ کیا کر سکتی ہے؟ اس نے بے بسی سے سوچا لیکن مفر کی کوئی صورت نظر نہیں آئی اور شادی کی تاریخ سر پر آ گئی۔ شادی سادگی سے ہونا طے پائی تھی۔ رات ہی بارات آنے والی تھی اور اس کے پاس وقت نہیں تھا، آخر اس نے ایک انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو موقع پا کر وہ گھر سے نکل آئی۔

وہ تیز قدموں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ اچانک اس کے قریب ایک کار رکی اور کسی نے آواز دی:

''صفیہ! کیا ہوا؟ اتنی تیزی میں کہاں جا رہی ہو''

اس نے ٹھٹھک کر کار کے دروازے کی طرف دیکھا جس سے معاذ سر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''میں ... میں سر.....''!

اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو معاذ سر نے کہا:

''پہلے کار میں بیٹھو پھر اطمینان سے بتانا۔ اس طرح بیچ سڑک پر رک کر باتیں کرنا مناسب نہیں''

انھوں نے دوسری سمت کا دروازہ وا کیا تو وہ اس میں سما گئی۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد معاذ سر نے پوچھا:

''ہاں تو کیا بات ہے؟ تم اس قدر پریشان کیوں نظر آ رہی ہو؟ کچھ دنوں سے کالج بھی نہیں آ رہی ہو۔''

''وہ سر !.... میرے والدین نے میری مطبوعہ کہانی دیکھ لی تھی۔ ابا کو اتنا غصہ آیا کہ میرا کالج جانا بند کر کے مجھے گھر میں قید کر دیا۔''

''یہ کیسی جاہلیت ہے؟''

معاذ سر نے حیرت سے کہا۔

''انھیں تو بیٹی کی یہ کامیابی دیکھ کر خوش ہونا چاہیے۔''

''انھیں یہ کامیابی نہیں بے حیائی لگتی ہے۔ انھوں نے میری شادی میری مرضی کے خلاف زبردستی ایک بیوی بچوں والے شخص سے طے کر دی۔ آج ہی نکاح ہونے والا ہے، کوئی راستہ نہیں سوجھا تو میں گھر سے بھاگ آئی، ریلوے اسٹیشن جا رہی ہوں۔''

''کیا کسی رشتہ دار کے پاس جانا ہے؟''

معاذ سر نے پوچھا تو اس کے چہرے پر اداسی کی پرتیں چڑھ گئیں۔

''نہیں سر، میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔''

''کیا؟ یہ کیسی بے وقوفی ہے، تب تو تمھیں پولیس اسٹیشن جانا چاہیے تھا، تم بالغ ہو تمھاری شادی کوئی زبردستی نہیں کر سکتا، تمھارے والدین بھی نہیں۔''

''میں نے پولیس اسٹیشن جانے کا سوچا تھا لیکن پولیس میرے ابا کو گرفتار کر لے جاتی اور یہ میں نہیں چاہتی۔''

''تم بھی عجیب لڑکی ہو چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں سر؟''

''میرے گھر اور کہاں؟ وہاں میری والدہ ہیں، نیک اور ہمدرد خاتون تمھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

وہ خاموش ہوگئی، کچھ دیر بعد کار ایک گھر کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ معاذ سر نے دروازہ کھولا اور اسے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ان کے پیچھے گھر میں قدم رکھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی تو ایک باوقار خاتون کی آمد ہوئی۔

''مجھے معاذ نے سب بتا دیا تم بے فکر ہو جاؤ۔ اب تم ایک

محفوظ گھر میں ہو، آگے کیا کرنا ہے کل سوچا جائے گا‘‘

دوسرے دن معاذ سرا اور ان کی والدہ اس کے گھر گئیں، وہاں صف ماتم بچھی تھی، بارات کل رات خالی ہاتھ لوٹ چکی تھی، انھوں نے شبیر احمد سے ملاقات کی اور صفیہ کے تعلق سے بات کی۔

’’میرا اب اس سے کوئی رشتہ نہیں میرے لیے وہ مرگئی۔‘‘

شبیر احمد نے سخت لہجے میں کہا۔ انھوں نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے، دونوں ناکام واپس آ گئے۔

’’اب کیا کیا جائے؟‘‘

راستے میں معاذ نے والدہ سے پوچھا تو وہ بھی متفکر سی بیٹھی رہیں۔

’’وہ ایک ذہین اور معصوم لڑکی ہے، اس وقت اس کا کوئی سہارا نہیں، اگر اسے یوں ہی بے سہارا چھوڑ دیا جائے تو کہیں اس کی زندگی برباد نہ ہو جائے‘‘

معاذ کے لہجے میں گہری فکرمندی جھلک رہی تھی۔

’’لیکن ایک جوان لڑکی کو یوں گھر میں رکھنا بھی ٹھیک نہیں، لوگ سو طرح کی باتیں بنائیں گے۔‘‘

معاذ کی امی کے لہجے میں وسوسے کی پرتیں چڑھی تھیں۔

قدرے توقف کے بعد جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچیں اور معاذ سے مخاطب ہوئیں۔

’’اگر تم اسے پسند کرتے ہو تو مجھے اسے بہو بنانے میں کوئی تامل نہ ہوگا‘‘

معاذ نے چونک کر اپنی امی کی طرف دیکھا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی اور کار آگے بڑھتی رہی۔ کار گھر کے قریب پہنچی تو معاذ نے فیصلہ کن انداز میں کہا:

’’اگر صفیہ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

گھر پہنچ کر معاذ کی امی نے صفیہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور آخر میں اپنی اور معاذ کی خواہش کا اظہار کیا۔

صفیہ تھوڑے سے پس و پیش کے بعد رضامند ہوگئی۔

بے حد سادگی سے نکاح ہوا اور صفیہ نے ایسی زندگی میں قدم رکھا جس کا اس نے خواب میں بھی گمان نہیں کیا تھا۔ معاذ ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال شخص تھا جس کی نگاہ میں ہر فرد اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ اس کا اپنا ایک فلک ہوتا ہے جس کی وسعتوں میں وہ آزادی سے اڑان بھرنا چاہتا ہے، اس کی اپنی ایک زمین ہوتی ہے جس پر وہ ثابت قدمی سے کھڑا رہنا چاہتا ہے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ اس پر قدغن لگائے۔

صفیہ نے اپنے تعلیمی سلسلے کے ساتھ تخلیقی کاوشیں بھی جاری رکھیں اور ہر دو محاذ پر کامیابی سے آگے بڑھتی رہی۔ معاذ ہر قدم پر، ہر موڑ پر اس کے ساتھ کھڑا تھا۔

خوشیوں کے پنکھ لگا کر ڈھیر سارے وقت گزر گئے۔ اب صفیہ ایک کالج میں لکچرر تھی۔ دنیائے ادب میں اس کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا تھا۔ کتنے ہی معتبر اداروں کے اعزازات و انعامات سے اسے نوازا گیا تھا۔

ایک دن وہ کالج سے نکل رہی تھی تو گیٹ پر اس کے والدین موجود تھے، وہ ٹھٹھک کر رک گئی اس کے ابا شبیر احمد آگے بڑھے اور گہری پشیمانی سے بولے۔

’’ہمیں معاف کردو بیٹی، ہم نے زندگی کو سمجھنے میں بھول کی، ہم نے لڑکیوں کو لڑکوں سے کمتر سمجھا اور یہ بھول گئے کہ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی نگاہ میں برابر ہیں۔‘‘

صفیہ آہستگی لیکن مستحکم لہجے میں گویا ہوئی۔

’’آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہر کوئی اپنے خیالات اور تعصّبات کا قیدی ہوتا ہے جن سے آزاد ہونا مشکل ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کو ہزار پردوں میں قید کر کے انھیں محفوظ رکھا جاسکتا ہے جب کہ لڑکیوں کے لیے سب سے اہم اور مضبوط پردہ تعلیم ہے جسے زیب تن کر کے وہ خود کو ہر آفت و غلاظت سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔‘‘

❑❑❑

Kazia Tazmin
Garden Reach
Kolkata-700024 (West Bengal)
kaziatazmeem@gmail.com

ارتباط

خواتین دُنیا جون 2025 کا نظر نواز ہوا۔ اس رسالہ کے موصول ہونے پر میں نے دیکھا کہ اتنے سارے روشن چاند مہر ورق کو تابدار کر گئے۔ اور نگاہوں کو مسرور کر گئے۔ اس شمارے میں درجہ ذیل مضامین 15 ہیں۔ سبھی مضامین دلچسپ ہیں۔ اس شمارے میں نامور مصنفہ عشرت ناہید نے شاعر پربھولال کی شخصیت کو بڑے انوکھے انداز سے سراہا ہے۔ علاوہ اس شمارے میں صوفیہ محمود بھی اپنی تحریر میں لکھتی ہیں۔ منفرد لب و لہجے کے شاعر محبوب انوار اردو ادب کے ایک مشہور شاعر رہے ہیں۔ ان کی شخصیت کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا ہے۔ صوفیہ محمود شاعر کے جذبات و انداز فکر لکھتی ہیں کہ اردو ادب میں انکی شاعری ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ مصنفہ سعدیہ زاہد کی تحریر بھی کچھ رہنمائی کرتی ہے۔ خاص ہے 'یوگا جسمانی اور ذہنی فلاح و بہبود کا راز' اس مضمون میں لکھتی ہیں: وقت کے ساتھ یوگا کو صرف روحانی مشق نہیں بلکہ سائنسی طرز عمل کے طور پر بھی تسلیم کیا گیا۔ یہ بات درست ہے۔ یوگا انسانی زندگی کے لیے مفید ثابت ہوا ہے۔ اس میں یوگا یا 'ریاضیت کا سائنسی تصور اور اہمیت' بڑے دلکش انداز میں تحریر کی ہے۔ اس کے بعد کا مضمون گلشن مسرت کا یوگا ہی سے تعلق ہے صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یوگا کا مقصد محض جسمانی مشق نہیں بلکہ انسان کو اپنے اندرونی فطرت اور خالق سے جوڑنا ہے۔ در اصل قابل مصنفہ یوگا کا ہنر جانتی ہیں۔ سائنس میں مصنفہ عرشیہ تسنیم انھوں نے چند سائنسدانوں کے حوالے سے سائنس کے اداروں میں زیادہ شمولیت پر زور دیا ہے۔ اپنی تحریر بہت بہترین طریقہ سے رقم کی ہے۔ خواتین بھی سائنس کی ایجادات میں کتنی ماہر ہیں۔ ہم صبح سے شام تک اپنے روز مرہ میں جن چیزوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اُن میں زیادہ تر سائنس کی ہی ایجادات ہوتی ہیں۔ صبح میں گھڑی کی الارم سے لے کر رات میں سوتے وقت ٹیوب لائٹ بند کرنے تک ہر طرف سائنس ہی سائنس ہے۔ سائنس صرف ریسرچ تک محدود نہیں ہے۔ صفحہ نمبر 24 پر عرفانی بیگم جہاں نسواں میں لکھتی ہیں: ' تدریس و اکتسابی عمل میں جدید کاری میں تحریر کی ہے کسی بھی سطح پر اکتساب کا تصور بغیر تدریس کے اور تدریس بغیر معلم کے نامکمل ہی نہیں بلکہ ناممکن سمجھی جائے گی۔' انھوں نے بڑے اچھے انداز میں تدریس و اکتسابی عمل کو پیش کیا ہے۔ معاشرے کے بننے اور بگڑنے میں اساتذہ کا اہم رول رہتا ہے۔ بغیر استاد کے علم نہ مکمل ہے۔

مصنفہ نے ایک ایک پوائنٹ دے کر درس و تدریس کی شکل بیان کی ہے۔ مہتاب جہاں نے اپنے مضمون میں نرگس جہاں کی علمی شخصیت کو بیان کیا ہے۔ اس میں سوانح حیات کو بھی بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ سیدہ تفسیر فاطمہ بھی قابل تعریف شاعرہ ہیں۔ انھوں نے نظم کو بڑے حسین انداز میں پیش کیا ہے۔ ریحانہ پروین نے تبسم

فاطمہ کے افسانوں میں نسوانی کردار اور مصنفہ اسماء قمر نے عبدالرحیم نشتر اور ادب اطفال کے تعلق سے بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانوں میں بھی مصنفہ رخشندہ روحی مہدی نے صفحہ نمبر 47 میں 'اندھیرے اُجالے' میں رامش کا کردار بڑے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ سعدیہ سلیم کے افسانے میں بھی نمرہ کا کردار جو دکھی ہونے کے ساتھ بلند ترظرف کردار ہے۔ یہ قابل تعریف افسانہ ہے۔ مصنفہ شاہ تاج بھی تعریف کے قابل ہیں۔ بہر حال یہ رسالہ خواتین دُنیا نسواں زندگی کے مختلف پہلوؤں۔۔۔ جیسے گھریلو زندگی، ازدواجی تعلقات، تربیت اولاد، دینی مسائل اور سماجی کردار پر گہرائی سے روشنی ڈالتا ہے۔ یہ شمارہ تعلیم اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے۔ اس میں خواتین کے حقوق، خود انحصاری اور باوقار زندگی کی اہمیت پر بھی زور دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ صحت تعلیم گھریلو معلومات سے آگاہ کرتا ہے۔ جو ہر طبقے کی خواتین کے لیے قابل فہم ہے۔ مجموعی طور پر خواتین دُنیا رسالہ ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو خواتین کی فکری، دینی اور اخلاقی کردار کو سنوارنے پر زور دیتا ہے۔

فرحین انجم، امراوتی مہاراشٹر

ماہنامہ خواتین دنیا (جولائی 2025) کا شمارہ نہایت وقار، فکری گہرائی اور جمالیاتی حسن کے ساتھ مطالعے سے گزرا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رسالہ نہ صرف ادبی معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہا بلکہ نسوانی شعور، تخلیقی اظہاریہ اور فکری رہنمائی کی ایک روشن مثال بھی قائم کی۔ بحیثیتِ اداریہ 'مشعل' مدیر محترم کی تحریر نے دل کو چھو لینے والا تاثر دیا۔

اس شمارے کا خصوصی گوشہ معروف افسانہ نگار بانو مشتاق کے نام رہا، جن کی کہانیاں نہ صرف علاقائی حقیقتوں کی عکاس ہیں بلکہ عالمی سطح پر ادبی شناخت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ ان پر شاداب شمیم کا مضمون 'علاقائی زبان سے عالمی ایوارڈ تک کا سفر' اور مہر فاطمہ کی تحریر "ہارٹ لیمپ" ان کی فنّی جہات کو خوبصورتی سے اجاگر کرتی ہیں۔

محمد عدنان صالحین نے بانو مشتاق کی افسانہ نگاری کو ایک عہد کی نمائندگی قرار دیتے ہوئے ان کے فن کی تہذیبی معنویت کو اجاگر کیا، جب کہ ثنا شمشاد کا مضمون 'ستاروں کے آگے' خواتین کے سائنسی کردار پر بصیرت افروز اظہار ہے۔

فریدہ صدیقی کا 'صنفی بجٹ سازی' خواتین کے اقتصادی مسائل کو اجاگر کرتا ہے، جب کہ بی بی رضا خاتون نے 'صغریٰ ہمایوں مرزا حیا' میں خواتین نثر نگاروں کے تخلیقی شعور پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔

فارسی کی ممتاز شاعرہ سیمین بہبہانی پر محمد افروز عالم کا مضمون روایت و جدت کے امتزاج کو نمایاں کرتا ہے، اور ترنم صدیقی نے 'مہاتما گاندھی کی نظر میں خواتین' کے تحت فکری انداز میں گاندھی جی کے نسوانی نظریات کو پیش کیا۔

اردو صحافت میں خواتین کے کردار پر 'آزادی کے بعد دہلی میں خواتین کے رسائل' (تحریر: عمران عاکف خان) اور تنقید کے باب میں 'سیما صغیر کی تانیثی تنقید' (آسیہ سلطانہ) قاری کو فکری مطالعہ فراہم کرتے ہیں۔

شاعری اور افسانہ نگاری کا حصہ بھی اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔ شازیہ ترنم، خوشبو پروین اور نازیہ افروز کی غزلیں جذباتی تہہ داری کے ساتھ نسوانی احساسات کی عکاس ہیں، بالخصوص خوشبو پروین کی غزل خواب، تعبیر، اور جذبات کی لطیف لہروں کو اس خوبصورتی سے پیش کرتی ہے کہ قاری ہر شعر میں ایک نیا خیال، نیا احساس محسوس کرتا ہے۔ جب کہ نیلوفر سعدیہ کا افسانہ "یوں ملے ہم" جذباتی گہرائی اور سماجی حقیقتوں کو بخوبی بیان کرتا ہے۔

مجموعی طور پر خواتین دنیا کا یہ شمارہ بھی فکری سمت، تخلیقی تنوع اور نسوانی وقار کا ایک زندہ اور روشن استعارہ بن کر سامنے آیا ہے۔ میں مدیر محترم اور پوری ادارتی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ وہ اس علمی و ادبی قافلے کو استقامت کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔

ابوشحمہ انصاری، یوپی بیورو چیف، ہفت روزہ ندائے کشمیر، بیورو چیف، نوائے جنگ لندن (لکھنؤ)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

قیام امن: ایک جستجو

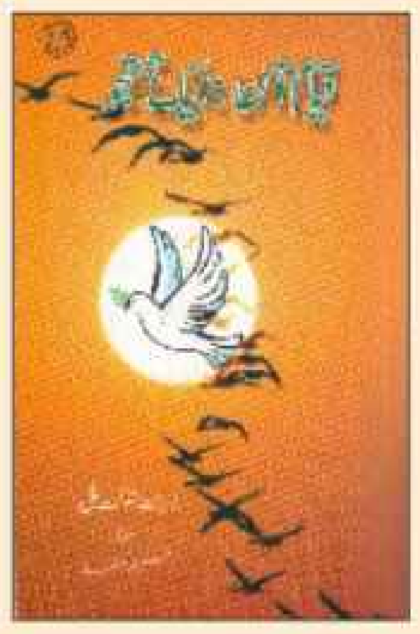

مصنف: زینت شوکت علی، مترجم: نسیم احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 586+xxii

قیمت: 310 روپے

پریم چند: مطالعے کی نئی جہتیں

مصنف: کمل کشور گوئنکا، مترجم: محمد صغیر حسین

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 283

قیمت: 165 روپے

سوانح عمری: حاجی محمد سمیع اللہ خان بہادر سی ایم جی

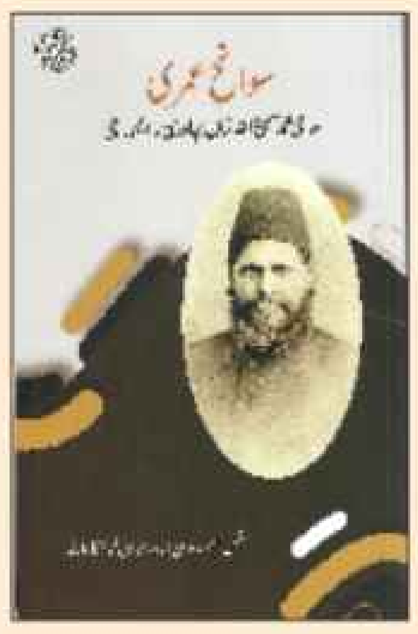

مصنف: شمس العلماخان بہادر مولوی محمد ذکاءاللہ

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 172+xii (حصہ اوّل)، 72+5 (دوم)

قیمت: 160 روپے

تنویر احمد علوی (مونوگراف)

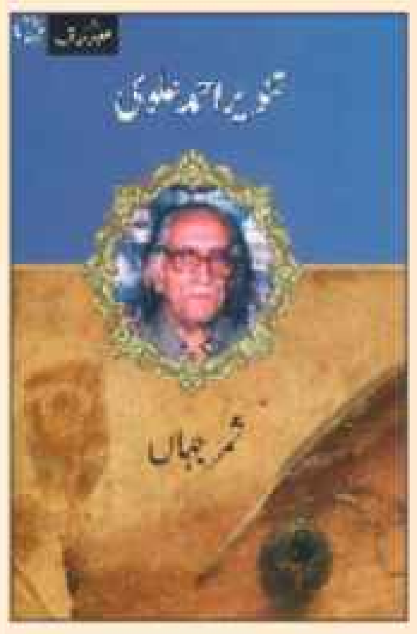

مصنف: ثمر جہاں

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 170

قیمت: 120 روپے

انسانی دماغ: کمپیوٹر اور تعلیم

مولف: انس مسرور انصاری

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 100

قیمت: 35 روپے

حالی کا سیاسی شعور

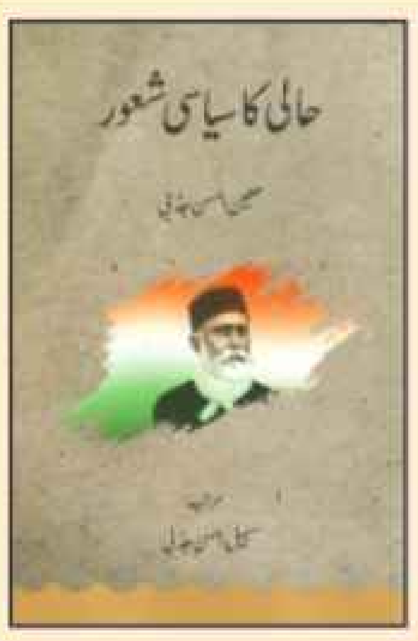

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

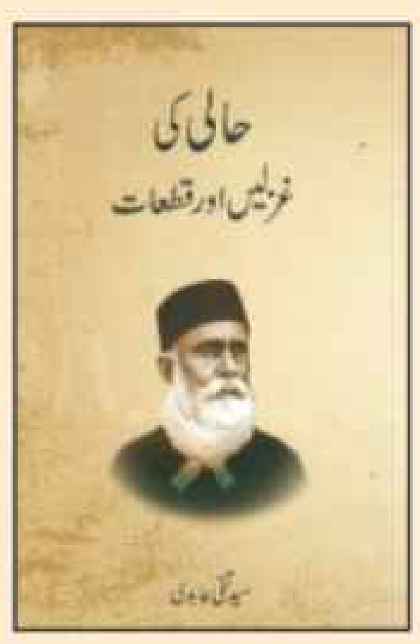

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 185+66

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

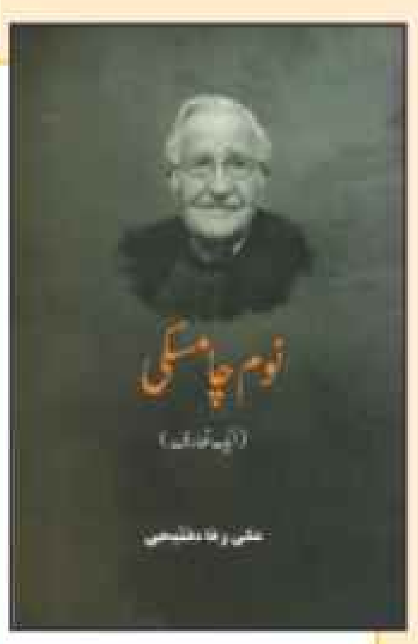

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, अगस्त-२०२५ वर्ष: ९, अंक: ८
Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2025, Vol.9, Issue: 8
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-08-2025
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025